ظفر حبیب

بدلتے رُت کی کہانیاں

(افسانوی مجموعہ)

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اردو اکادمی کا مالی تعاون شامل ہے۔
نظریات و موضوعات سے اکادمی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

بدلتے رُت کی کہانیاں

(افسانوی مجموعہ)

ظفؔر حبیب

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

BADALTE RUT KI KAHANIAN (Fiction)

by : Prof. Zafar Habib

Year of Edition 2009
ISBN 978-81-8223-623-3

Price Rs. 120/-

نام کتاب : بدلتے رُت کی کہانیاں (افسانوی مجموعہ)
مصنف وناشر : ظفر حبیب
پیشہ : ملازمت
صدر شعبۂ اردو (پی۔ جی) ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ
سنِ اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : ۱۲۰ روپے
کمپوزنگ : افضل، پرومپٹک کمپوٹرس، دربھنگہ۔ (Mob:9905228544)
زیرِ اہتمام : اشرف پبلی کیشنز، بیت الشرف۔ عبدالحبیب کالونی
لکھمنیاں، ضلع بیگوسرائے۔ ۸۵۱۲۱۱ (بہار)
مطبع : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۶

تقسیم کار

(۱) اشرف پبلی کیشنز۔ لکھمنیاں، ضلع بیگوسرائے۔ ۸۵۱۲۱۱ (بہار)
(۲) ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ۔ دربھنگہ (بہار)
(۳) کتابستان۔ مارکیٹ ٹوڈے، بیگوسرائے (بہار)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

معنون

اپنی اُن نسلوں کے نام
جن کے لئے
وقت کے سیلِ رواں میں تحلیل ہو کر
میں کہانی بن جاؤں گا!
مگر
سطحِ آب پر یہ کہانیاں
اُن کے لئے نشانِ منزل
بن کر رہیں گی!!

انشاء اللہ

وقت کے ماتھے پر تو بھی
اپنی ایک کہانی لکھ

(تپش)

وَتِلْكَ الْاَیَّامِ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ (القرآن)

اور میں زمانے کو انسانوں کے درمیان پلٹتا رہتا ہوں (ترجمہ)

کیا؟

کہاں سے؟

کہاں تک؟

اپنے دل میں چھپی کچھ کہانی بھی تھی، وہ کہانی جہاں کو سنانی بھی تھی

اس لئے باغِ جنت کے سارے مزے، چھوڑ کر آ گئے ہم یہاں دوستو

(ظفرؔ حبیب)

ترتیب

☆☆

مقدمہ

آج سے ربع صدی قبل میں نے ایک مقالہ میں اردو افسانہ کے امکانات اور وسعتوں کا جائزہ لیتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی سے اتفاق کیا تھا کہ افسانہ کی بنیادی خصوصیت اس کا بیانیہ ہے اور یہ کہ افسانہ وقت کے چوکھٹے میں قید ہوتا ہے اور اس سے نکل نہیں سکتا اور وقت کا محکوم ہے اس لئے وہ ہم آپ کی ان پیچیدگیوں اور مجبوریوں کا اظہار کر سکتا ہے جو شاعری کے ہاتھ نہیں لگتیں۔ میں نے اسے افسانہ کا نشان امتیاز قرار دیا تھا اور وقت یا عصر رواں یا عصر رفتہ سے اس کے گہرے تعلق میں اس کے بسیط امکانات اور بیکراں وسعتوں کا راز پنہاں سمجھا تھا۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک مشہور سورۃ کا حوالہ دیا تھا جس میں وقت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ اس جہان گذراں میں انسان خسارہ میں ہے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے ایمان کی توانائی حاصل کی ہے اور وقت کی لگام مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی ہے اور حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ شاید ایک اسلام پسند افسانہ نگار کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام حادثات اور واقعات کی کڑیوں کا سلسلہ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین سے مربوط کر دے۔ عصر رواں میں انسان کے خسارہ سے بچنے کی یہی واحد راہ ہے۔ وقت کی بساط پر خیر و شر کے معرکے مسلسل برپا ہو رہے ہیں مگر ایک اسلام ادیب و افسانہ نگار خیر کی بالآخر فتح کی گواہی دیتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ صنف ادب جو منشی پریم کے وقت سے صحیح سمت میں گامزن تھی بعد میں لغو و لاطائل داستان طرازی کا مجموعہ بن گئی اور قرانی اصطلاح میں لہوالحدیث کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ رومان پرستوں اور ترقی پسندوں نے اس کی تصویر بگاڑ دی اور نوابین اودھ کے عہد میں جو کام ریختی اور واسوخت سے لیا جاتا تھا وہ ذمہ داری افسانہ نے اٹھائی۔ انسان کو مکمل برہنہ کرنے کا نام

حقیقت نگاری قرار پایا۔ انسان کے جنسی مشاغل کی تصویر کشی اس کی نفسیات کی نقاب کشائی قرار پائی۔ چنانچہ افسانہ کی تصویر روز بروز خراب ہوتی گئی۔ لیکن یہ صرف ایک حلقہ کے نامور افسانہ نگاروں کے کرتوت تھے۔ اہل قلم کا ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو افسانہ کے ذریعہ ہماری صحت مند قدروں کی عکاسی کرتا ہے اور انسان کے دکھ درد، محرومیوں، ناکامیوں کا مداوا تلاش کرتا رہا اور اپنے اعصاب پر صنف نازک کو مسلط نہیں ہونے دیتا۔ گذشتہ نصف صدی سے تعمیر پسند افسانہ نگاروں کی اسی صف میں ہمارے دوست ظفر حبیب بھی شامل ہیں جن کا تیسرا افسانوی مجموعہ "بدلتے رت کی کہانیاں" منظر عام پر آرہا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۰ء میں "آنگن آنگن" اور "جنگل کا سفر" ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ اس مجموعہ کی کہانیوں میں اہم موضوعات مسلم معاشرہ میں تکلیف دہ رسوم، فسادات، ہندوستانی سماج کے پس ماندہ طبقات کے مسائل اور ان کی انقلاب آفریں تحریکیں ہیں۔ ظفر حبیب اپنے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں اور ان کے احساسات میں عصر رواں کے تمام زخموں کراہوں اور درد و چیخ کا انعکاس نظر آتا ہے لیکن وہ خود اپنے الفاظ میں اعلان کرتے ہیں کہ "میں اور میرے کردار کہانیوں میں صرف روتے اور منہ بسورتے ہی نہیں رہے بلکہ ہم نے بلند حوصلوں کو دعوت دی ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا پیغام بھی دیا ہے"۔

ظفر حبیب صاحب کی کہانیاں ادارۂ ادب اسلامی کے ترجمان ماہنامہ "پیش رفت" دہلی میں بھی شائع ہوتی رہی ہیں اور دیگر حلقوں میں انہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ اذان حق بلند کی ہے۔ مجموعہ کی پہلی کہانی ہی فسادات کے منظر نامہ سے شروع ہوتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مرکزی کردار دو سیدھے سادے اور اچھے مزاج کے غیر مسلم ہیں جو حالات کی سنگینی سے مضطرب ہیں۔ آخر میں افسانے کا رخ اعلان توحید کی طرف مڑ جاتا ہے مگر افسانہ نگار کہانی کے پلاٹ کی دلکشی کو برقرار رکھتا ہے اور حتی الامکان افسانہ کو وعظ و نصیحت نہیں بننے دیتا۔ اسی طرح "روشنی بکھرنے دو" کے پلاٹ کے مرکزی کردار دو غیر مسلم ہیں اور ان کے عروج پھر ان کے انسانی زوال کی داستان بڑے دلکش پیرایہ میں بیان کی گئی ہے کہ انسان خدا کی نعمتوں کو اگر صحیح طریقوں سے استعمال نہ کرے تو وہ کس طرح اس کے لئے عذاب

بن جاتی ہیں۔

ظفر حبیب کے افسانوں میں پلاٹ گٹھا ہوا اور بیانیہ کافی دلکش ہوتا ہے۔ وہ کردار نگاری کے فن سے واقف ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کو ابہام سے پاک رکھتے ہیں وہ اپنے پلاٹ کو معمہ نہیں بننے دیتے جیسا کہ گذشتہ دس بیس سالوں پر نوجوان افسانہ نگاروں کی ایسی جماعت سامنے آئی جس نے افسانہ کو ایسی علامتیت، رمز و کنایہ اور ابہام و ایمائیت کے حصار میں بند کر دیا ہے کہ اس کو دیکھ کر بس افسانہ نگار کی یہی منشا سمجھ میں آتی ہے کہ اس کا مدّعا یہ ہے ۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

پرانے زمانہ کی یہ کہاوت ان افسانوں کو پڑھ کر تازہ ہوتی ہے۔

لال بجھکڑ بوجھ گئے اور نہ بوجھا کوئی

پیر میں چکی باندھ کے ہرن نہ کودا ہوئے

لیکن ظفر حبیب کے افسانے اس الزام سے بری ہیں۔ ان کا بیانیہ بے داغ، ان کے کردار متحرک، ان کے پلاٹ ایک متعین منزل کی طرف لے جانے والے اور ان کی زبان شستہ و رواں ہے ان خوبیوں کے ساتھ اپنی کچھ کمیوں کے باوجود ان کے افسانے کافی دلپذیر ہیں اور قاری کے ذہن و دماغ کو روشنی عطا کرنے والے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اس مجموعہ کو پسند کیا جائے گا اور اس وقت نئی کتابوں کے ہجوم میں یہ اپنی انفرادیت کی وجہ سے مقبولِ عام ہوگا۔

ڈاکٹر سید عبدالباری

☆☆

کہانی مجھے لکھتی رہی

''بدلتے رت کی کہانی'' نام کا یہ مجموعہ میرے طبع زاد افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جب کہ کہانوی ادب کا یہ تیسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ''آنگن آنگن'' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں بہار اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں دنیا کے مستند اور معروف افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانوں کا ترجمہ شامل ہے۔ جس کی پسندیدگی اور معیاری ہونے کا ایک واقعہ یوں ہے کہ میرے برادر عزیز نذر الاسلام (نذر رحمٰن) سلمہٗ جو اس وقت خیر سے گورنمنٹ اردو ہائی اسکول، پارک سرکس کلکتہ میں ہیڈ ماسٹر کے منصب پر فائز ہیں جناب سالک لکھنوی کے یہاں ایک دن گئے۔ دیکھا کہ وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے موصوف کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''دراصل اس وقت میں ایک انگریزی افسانہ کا اردو ترجمہ کر رہا تھا''۔ نذر الاسلام نے پوچھا کہ ''وہ کون سا افسانہ ہے''؟ کہنے لگے ''افسانہ تو روسی زبان کا ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ وہ افسانہ چیخوف کا ہے''۔ نذر الاسلام نے پوچھا کہ وہ افسانہ ''اے ورک آف آرٹ'' تو نہیں ہے؟ کہنے لگے ہاں ہاں وہی ہے۔ نذر الاسلام نے جواب دیا لیکن بھیا تو اس کا ترجمہ بہت پہلے کر چکے ہیں؟ سالک صاحب فوراً اٹھے اپنی شیلف سے ''آنگن آنگن'' اٹھالائے۔ وہ یہ مجموعہ پڑھ چکے تھے کہنے لگے اب اس کے بعد اس کے ترجمہ کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔''

میرا دوسرا افسانوی مجموعہ ''جنگل کا سفر'' (طبع زاد افسانوں کا پہلا مجموعہ) بھی ۱۹۸۵ء میں بہار اردو اکیڈمی ہی کے تعاون سے شائع ہوا۔ جہاں سے میری فکر کی آباد دنیا کا اشتہار شروع ہوا۔ میں نے ہمیشہ اپنے گرد وپیش کے روزمرہ کے مسائل پر توجہ دی۔ انہیں واقعات و حادثات، جذبات و کیفیات، تصاویر و مناظر کے قرطاس ابیض تیار کئے جو مجھ کو اہم اور

انتہائی اہم نظر آئے۔ میرے اس کام کا آغاز اس وقت ہوا جب میں ۱۹۶۱ء میں دسویں کلاس کا طالب علم تھا۔ واضح رہے کہ اس دور میں گیارہویں کلاس پاس کرنے کے بعد میٹرک کی سند ملا کرتی تھی اور میں عمر کے پندرہویں زینہ پر قدم رکھتے ہی اس سند کا مالک بن چکا تھا۔ یہ بھی لکھتا چلوں کہ اس زمانہ میں میٹرک کے بعد پری یونیورسٹی کا ایک سالہ کورس ہوا کرتا تھا پھر بی۔اے پارٹ ون کا بھی ایک سالہ کورس ہوا کرتا تھا۔ تب جا کر بی۔اے آنرز کا دو سالہ کورس آنرز کے آٹھ پرچوں کے ساتھ پاس کرنا پڑتا تھا۔ ناچیز کو رب کائنات نے ۱۹۶۲ء میں میٹرک، ۱۹۶۳ء میں پری آرٹس، ۱۹۶۴ء میں بی۔اے پارٹ ون، ۱۹۶۶ء میں بی۔اے آنرز اردو اور ۱۹۶۸ء میں ایم۔اے اردو کی سند دے کرائے۔ پی۔ایس۔ایم۔کالج برونی میں ۱۹۶۹ء میں (۲۲ رسال کی عمر میں داخل ہوتے ہی) لکچرر شپ کا پُروقار منصب عطا فرما دیا تھا۔ تمام حمد و ثنا اس رب العالمین کے لئے ہے جو رحمٰن ورحیم ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　بات پہنچی "مری" جوانی تک

یہ کلمات۔ شکرِ پروردگار کے ہیں۔ جن کا بار بار دہرانا لازمۂ بندگی ہے۔ جس کا مجھ کو اور زیادہ اجر ملنے والا ہے۔

میں دسویں درجہ کا طالب علم تھا۔ ایک واقعہ میری نظر سے گذرا تھا۔ دو بھائی بہنوں نے برسوں قبل یہ طئے کر لیا تھا کہ ہم لوگ اپنے بچوں اور بچیوں کی شادی ایک دوسرے سے کر دیں گے۔ پھر یہ ہوا کہ ان میں سے ایک کے صاحبزادے تجارت کے میدان میں اتر گئے اور دوسرے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں لگ گئے۔ تجارت نے فروغ پایا اور موصوف کے سر میں دولت کا نشہ سمایا۔ ایک دن گھر میں یہ اعلان ہو گیا کہ جو رشتہ والد نے طئے کیا ہے وہ ممکن نہیں ہے۔ یہ خبر جب فریق ثانی کے گھر پہنچی تو ایک ماتم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جانبین کے جذبات جو ایک معینہ رخ پر رواں تھے یکا یک اسے جھٹکا سا لگا۔ میں نے ماتم نما گھر کے افراد کو دیکھا تھا اور بات یہ سمجھ میں آئی تھی کہ دولت جب آتی ہے تو تکبر اور تفاخر اپنے ساتھ لے کر آتی ہے اس کے برخلاف کم مائیگی ہمیشہ ذلت و رسوائی کا سبب بنتی رہی ہے۔ میں نے قلم اٹھایا اور اس واقعہ کو قلم بند کر دیا۔ نام لئے بغیر سیدھے طور پر وہ سب کچھ لکھ دیا جو میں

نے دیکھا تھا اور اس سے جو درس لیا تھا۔ پھر وہ کہانی لے کر اسٹوڈنٹس اردو لائبریری لکھمنیاں کے سالانہ جلسہ کے انعامی مقابلہ میں سنانے کو حاضر ہو گیا۔

خیر یہ ہوئی کہ اس کہانی کو میرے ایک بزرگ نے سن لیا۔ کہنے لگے ''نہیں بیٹے اس سے تنازعہ بڑھ جائے گا اور تمہیں باغی قرار دیا جائے گا''۔ میری باغیانہ فطرت نے اسی وقت ان کے سامنے اس کہانی کو پھاڑ کر پھینک دیا اور میں وقت کا انتظار کرنے لگا اور اپنے پیر پر کھڑا ہونے کا جتن کرنے لگا۔ اسی دن سے دولت حشمت سے میری ان بن ہو گئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے منہ موڑ لیا۔ اتنا ہی نہیں ہوا یہ بھی ہوا کہ زندگی کے ہر موڑ پر دولت میری ٹوپی اچھالنے کی تاک میں لگی رہی اور میں بھی ہمیشہ اس کا منہ چڑھاتا رہا۔ میں کمزوروں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ زندگی کے ان مسائل کو میں نے بطور موضوع اختیار کیا جو کمزوروں کے گھروں کی ویرانی کا سبب بنتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے عورت کو کمزور دیکھا۔ اسے تلک اور جہیز کی چکیوں میں ریزہ ریزہ ہوتا ہوا پایا۔ اس لئے اس موضوع پر لگاتار کئی کہانیاں میں نے قلم بند کیں۔ میری ازدواجی زندگی کا آغاز اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ہوا لیکن میری باضابطہ اولین کہانی ''نشتر قریب رگِ جاں'' (جنگل کا سفر) مرقومہ ۲۰ ستمبر ۱۹۶۹ء میں میری پہلی بیٹی ثمینہ پیدا بھی ہوئی۔ کالج میں پڑھتی ہوئی جوان بھی ہوئی۔ مجھ کو اس کی شادی کی فکر بھی ہوئی۔ میں اس کے لئے کالج میں نظر نظر لڑکا بھی ڈھونڈنے لگا۔ ایسا لڑکا جو بغیر تلک اور جہیز کے میری بیٹی ثمینہ کو خوشی خوشی اپنے گھر لے جائے اور خوشیوں بھری زندگی اسے عطا کرے۔

یہ سب میرے رب نے مجھ سے لکھوایا پھر یہ بھی ہوا کہ فروری ۱۹۹۱ء میں میری پہلی بیٹی کہکشاں واقعی بغیر تلک اور جہیز کے اپنی سسرال چلی گئی۔ خدا نے چاہا تو خوشیوں بھری زندگی بھی اسے مل جائے گی۔ گرچہ اس وقت وہ میکنگ پریڈ میں ہے اور اسٹرگل کر رہی ہے۔

مجھ کو دوسری کمزور چیز امت مسلمہ کی شکل میں ملی جس پر اس آزاد جمہوری ملک میں فرقہ وارانہ فساد کا سب سے بڑا عذاب نازل ہوا۔ میں نے لگاتار فرقہ وارانہ فسادات کے مختلف پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے کہانیاں لکھنے کی کوشش کی اور میں پورے اعتماد کے

ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر لکھی جانے والی کہانیوں سے الگ ہٹ کر میری کہانیاں لکھی نظر آئیں گی۔ ''دو بوڑھے''، ''روشنی بکھرنے دو''، ''وتلک الایام''، ''عینک'' اور ''سارے جہاں سے اچھا'' جیسی کہانیاں اس کا ثبوت ہیں۔

تیسرا مسئلہ آزادیٔ نسواں کا ہے اور جس کے زیر اثر بکھرتا اور ٹوٹتا ہوا خاندان اجڑی اور لٹتی ہوئی جوانیاں، خواتین کی ذلت یہ سب بھی میرے موضوعات بنے۔ ''حی علی الفلاح'' جیسی کہانی کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی تمام کہانیاں نئے نئے مسائل کو نئے نئے ڈائمنشن سے دیکھتی ہوئی نظر آئے گی۔

ہندوستان کے پسماندوں اور دلتوں کی انقلاب آفریں تحریک پر لکھی گئی کہانی ''تیسری آزادی'' ایک خاص توجہ چاہتی ہے اور ''عینک'' بھی ایک جداگانہ انداز رکھتی ہے۔

میں اور میرے کردار کہانیوں میں صرف روتے اور منہ بسورتے ہی نہیں رہے بلکہ میں نے بلند حوصلوں کی دعوت بھی دی ہے اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کا پیغام بھی دیا ہے یہی وجہ ہے کہ میری تمام کہانیاں ریڈیو سے نشر ہوئیں۔ معیاری رسائل میں شائع ہوئیں۔ بنگلہ دیش اور پاکستان والوں نے بھی انہیں خاطر میں لایا اور تعمیر پسندوں کے درمیان کہانی لکھنے والوں کی کمی پورا کرنے میں میری کہانیاں کامیاب ثابت ہوئیں۔

لطف کی بات یہ بھی ہے کہ جب ترقی پسندوں کا دبدبہ پوری اردو دنیا پر قائم تھا اور میں ''رائٹ ری ایکشنری رائٹر'' کے خطاب سے سرفراز تھا اس زمانہ میں بھی میں نے ریڈیو کے سہارے لاکھوں عوام تک زندگی کا جانفزا پیغام نشر کیا اور تعمیر پسندوں کے رسائل سے الگ ہٹ کر اپنا نظریۂ حیات اس پلیٹ فارم پر پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی جہاں سے تعمیر پسندی کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا تھا

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

میں نے جس زمانہ میں یہ کہانیاں ضبطِ تحریر میں لائیں وہ اس زمانہ سے زیادہ اب کے زمانہ کے لئے ہیں اور اس آنے والے دور کے لئے ہیں کہ جس کا سورج صبح کاذب دکھا رہا ہے۔

میرا یہ تیسرا افسانوی مجموعہ بھی بہار اردو اکیڈمی کے تعاون ہی سے شائع ہو رہا ہے۔ میں اسے اپنا آخری مجموعہ قرار دے رہا ہوں۔ اب یہ زندگانی ٹھکانے لگنے والی ہے۔ زندگی کے باسٹھ برس پورے ہو چلے۔ دنیا کی عظیم الشان ہستی رسولِ اکرمؐ نبی آخرالزماں کو ربِ کائنات نے اتنی ہی مہلت حیات عطا فرمائی تھی۔ وہ معصوم تھے۔ مزکّی و مصفّٰی تھے۔ اب اگر اس ناچیز کو کچھ فرصت حیات ملنے والی ہے بھی تو وہ صرف مہلت توبہ اور وقتِ استغفار ہے۔ اس مہلتِ توبہ میں اگر کچھ لکھنا ہے تو اس امت مسلمہ کے زوال کو عروج میں بدلنے کے لئے بشکلِ مضامین لکھنا ہے اور اپنے اس وطنِ عزیز کے بہتر مستقبل کی نشاندہی کے لئے لکھنا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کام ہیں جو ادھورے پڑے ہیں۔ شاید پروردگار انہیں پورا کرنے کی مہلت عطا کر دیں ۔

باتیں ہماری سن لیجئے پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا
(میر تقی میرؔ)

۲۴ مئی ۲۰۰۹ء

ظفرؔ حبیب

دو بوڑھے

شامو گرچہ سو چکا تھا۔ لیکن اب بھی رہ رہ کر سسکیوں کی آواز اس کے منہ سے نکل ہی جاتی تھی۔ اس لگاتار سسکی نے اس کی ماں کو آخر اس بات کے لئے مجبور کر دیا کہ وہ اس سے کچھ تسلی آمیز باتیں کہے......... حالانکہ آج اس کی ماں کو بھی اس بات کا بہت دکھ تھا کہ شامو نے بکریوں کو سویرے لا کر باندھ دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ سب بھوکی تھیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہر رات اسے ساتھ آٹھ کیلو دودھ دوہنے کو مل جاتا تھا جب کہ آج مشکل سے وہ چار کیلو دودھ دوہ سکی تھی۔ اگر دودھ اتنا نہیں گھٹ گیا ہوتا تو شاید اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

شامو کی ماں بار بار یہ سوچ رہی تھی کہ آج دودھ کا جو گھاٹا ہوا ہے اس کی وجہ سے اسے اپنی کئی ضرورتوں کو کاٹنا پڑے گا......... یہی وجہ تھی کہ جب شامو کے باپ نے شامو کو پیٹا تھا تو وہ کچھ نہ بولی بلکہ شامو پر اس نے ظاہر کیا کہ وہ بھی اس کی اس حرکت سے ناراض ہے۔

لیکن شام سے لگاتار رات کے آٹھ بجے تک شامو کا سسکیاں لے لے کر رونا اس کی ممتا کے خاموش سمندر کو متلاطم کر گیا۔

بیٹا۔!

اے شامو بیٹا۔!!

ماں کی دوسری آواز پر شامو نے آنکھ کھول دی اور پھر پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں نے یہ سمجھا کہ شاید باپ کی مار کا آج شامو نے گہرا اثر قبول کیا ہے حالانکہ اس کا باپ اس سے قبل بھی اسے کئی بار پیٹ چکا ہے بلکہ آج کی بہ نسبت اسے اس سے زیادہ مار لگ چکی ہے۔ اس لئے اس کی ماں نے شامو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

بیٹا! یہ بکریاں ہماری روزی روٹی کا سہارا ہیں۔ ایسے وقت میں جب کہ شہر میں

کرفیو لگا ہے تمہارے بابو جی سودا بیچنے بازار بھی نہیں جا سکتے تو یہ بکریاں ہی ہمارے لئے سب کچھ ہیں۔ تم اسے چراؤ گے نہیں تو یہ دودھ کہاں سے دیں گی۔؟

شامو ماں کی بات سن رہا تھا لیکن اس کی سسکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ وہ گھبرائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ شامو جو پندرہ سولہ برس کا ایک لڑکا تھا۔ دن بھر پہاڑیوں پر بکریاں چرایا کرتا تھا اور سورج ڈوبتے ڈوبتے ان بکریوں کو گھر لا کر باندھ دیتا یہ اس کی ہر روز کی ڈیوٹی تھی۔ آج نہ جانے کیوں سویرے چراگاہ سے واپس آ گیا تھا اور آنے کے بعد بہت گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

ماں کے سمجھانے بجھانے پر اس نے اپنی ماں کو یہ بتایا کہ پچھلے کئی دنوں سے جب وہ پہاڑیوں کے بیچ بکریاں چرانے جاتا ہے تو وہ ایک عجیب سا منظر دیکھتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ دونوں پہاڑیوں کے بیچ میں ایک ٹیلہ پر دو بوڑھے آدمی صبح سے شام تک بیٹھے رہتے ہیں۔ آج یہ ہوا کہ میری دو بکریاں چرتی ہوئی ان دونوں آدمیوں کے بہت قریب چلی گئیں۔ میں نے بہت انتظار کیا کہ وہ خود ہی لوٹ کر چلی آئیں گی لیکن جب کافی دیر ہو گئی تو میں چھڑی ہاتھ میں لے کر ان بکریوں کو ہکانے کے لئے ان دونوں آدمیوں کی جانب بڑھا۔ جب میں ان کے بہت قریب چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ یہ دونوں آدمی بہت بوڑھے ہیں۔ دونوں کے چہروں پر گہری جھرّیاں ہیں۔ دونوں کے بال بہت لمبے لمبے ہیں دونوں خاموش اور مایوس بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کا منہ حیرت سے تک رہے ہیں۔

میں جب ان کے بہت قریب چلا گیا تو دونوں یکا یک اٹھ کھڑے ہوئے اور میری جانب اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ جیسے وہ لوگ اپنی بانہوں میں مجھ کو بھر لینا چاہتے ہوں۔ بس یہی دیکھ کر میرے منہ سے ایک چیخ نکلی اور میں تمام بکریوں کو لے کر بھاگ آیا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ دونوں بکریاں بھی میرے ساتھ آئی ہیں یا نہیں۔

شامو کی ماں نے اسے بتایا کہ اس کی سبھی بکریاں اس کے ساتھ گھر آ گئی ہیں اور اسے اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب وہ اپنے گھر میں ہے اور بالکل محفوظ ہے۔ ماں کا دلاسہ سن کر شامو کو قدرے سکون ملا اور وہ ماں کے آنچل سے لپٹ کر سو گیا۔ لیکن شامو

کی ماں کا ذہن بھٹکنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کیا وہ شیو اور پاروتی تھے۔؟ لیکن وہ لوگ اتنے بوڑھے کیسے ہو گئے۔؟ پھر اسے خیال آیا کہ شیو کے گلے میں بڑا سا اجگر لپٹا رہتا ہے اور سر کی جٹا سے گنگا کی دھارا پھوٹتی ہے۔ اور شامو نے یہ سب کچھ تو نہیں بتایا۔

پھر اسے لگا کہ وہ کوئی دیو اور دیونی ہوگی۔ پہاڑوں پر دیو کا بسیرا ہوتا ہے۔ لیکن پھر اس کے دل نے کہا۔ دیو بوڑھا کیوں کر ہو گیا؟ مایوس کیوں رہے گا۔؟ شامو کو اپنی بانہیں پھیلا کر کیوں بلائے گا۔؟ بھاگ جانے پر پھر اسے پکڑ کیوں نہ لے گا۔؟ اسی سوچ میں وہ بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی کہ قریب کے گاؤں سے آواز آئی۔۔

اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم
اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم

شامو کی ماں ہر روز یہ آواز سن کر اپنا بستر چھوڑ دیتی تھی۔ حسب معمول آج بھی وہ یہ آواز سن کر بستر سے الگ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد شامو کا باپ بھی بستر چھوڑ کر اٹھا اور دونوں اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شہر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہر طرف کرفیو لگا تھا۔ سارا کاروبار بند تھا بکریوں کا دودھ۔ جسے وہ بیچ سکتا تھا، پی سکتا تھا اور پکا کر کھا سکتا تھا۔

شامو کا باپ جو آزادی سے پہلے پیدا ہوا تھا۔ جس کی عمر اب پچاس کی دہائی میں داخل ہو چکی تھی۔ جس نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا تھا کہ اس کے پتا جی اور شیخ قطب علی انتہائی گہرے دوست تھے۔ جس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کے پتا جی اور کتب چچا دونوں مل کر گوروں کو گالیاں دیتے تھے اور دونوں مل کر ریل کی پٹریاں اکھاڑنے گئے تھے۔ اس وقت اسے کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کتب چچا اس پہاڑ پر جایا کرتے ہیں جہاں ایک درگاہ ہے اور اس کے پتا جی دوسرے پہاڑ پر جاتے ہیں جہاں ایک مندر ہے۔ وہ تو بس یہ دیکھتا تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ واپس آتے ہیں۔ لیکن آج وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ کچھ لوگ بھالے اور برچھیاں لے کر درگاہ ڈھانے کے لئے جاتے ہیں تو دوسری طرف سے کچھ لوگ دوسرے پہاڑ پر چڑھائی کرنے کی پلاننگ بناتے ہیں جس پر

مندر بنا ہوا ہے۔

شامو کا باپ اس بدلی ہوئی صورت حال کو سمجھنے سے معذور تھا۔ اب اسے اس بات کا زیادہ دکھ تھا کہ وہ شہر نہیں جا سکتا ہے۔ جہاں وہ جا کر کچھ دھندھا کرتا تھا اور شامو کی ماں کے لئے کھانے پینے کا سامان لایا کرتا تھا۔ پچھلے ایک ہفتہ سے اس کا شہر جانا بالکل بند تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں پولس کا پہرا ہے اور لوگ بسوں سے اتار اتار کر مار دیئے جاتے ہیں۔

شامو کی ماں کو صبح یہ فکر لاحق تھی کہ شامو کل بری طرح ڈر گیا ہے۔ کہیں آج وہ بکریاں چرانے سے انکار نہ کر دے۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ بھی سوچنا پڑ رہا تھا کہ آخر وہ دونوں کون تھے۔؟ شامو یہ کہتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو پچھلے ایک ہفتہ سے دیکھ رہا ہے۔

یہ لوگ صبح سے شام تک دونوں پہاڑیوں کے بیچ میں ایک بڑے ٹیلہ پر بیٹھے رہتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو مایوس سے دیکھتے ہیں۔ شامو کہتا ہے کہ دونوں بوڑھے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شامو کی ماں نے شامو کو بلا کر کہا کہ وہ بکریاں لے کر آج بھی چرانے جائے اور اسی طرف جائے۔ ہاں اس کا خیال رکھے کہ بکریاں اس طرف نہیں جائیں جہاں پر وہ لوگ بیٹھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج وہ لوگ نہ آئیں۔

شامو بہت گھبرایا ہوا ہے لیکن اسے باپ کی مار یاد آ جاتی ہے اس لئے وہ بکریوں کے ساتھ پھر انہیں دونوں پہاڑیوں کے بیچ چلا جاتا ہے۔

یہ دونوں پہاڑیاں دھرم استھان ہیں۔ دونوں کی اونچائی دور سے ایک سی لگتی ہے لیکن دونوں پر جانے والے لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک پر لوگ دھوتی پہن کر جاتے ہیں اور دوسرے پر لنگی پہن کر۔

شامو شام کے وقت جب گھر لوٹتا ہے تو اس کی ماں کی جان میں جان آتی ہے۔ وہ سب سے پہلے شامو کی بلائیں لیتی ہے اور تب اس سے پوچھتی ہے کہ کیا آج بھی اس نے ان دونوں کو دیکھا تھا۔؟

شامو کی گفتگو میں آج کچھ دلچسپیاں شامل ہو گئی تھیں۔ اس نے بتایا کہ آج بھی

اس نے دونوں کو دیکھا ہے اور غور سے دیکھا ہے۔ دونوں میں سے ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ دونوں کا قد بہت لمبا ہے۔ دونوں کے بال بھی بہت لمبے لمبے ہیں۔ دونوں کا جسم جانوروں کی کھال سے ڈھکا ہے۔ دونوں غم زدہ ہیں اور ایک دوسرے کا منہ حیرت سے تکتے ہیں۔

''کیا آج بھی ان لوگوں نے تم کو اپنی طرف بلایا تھا''۔؟

''نہیں وہ لوگ بالکل خاموش سر جھکائے ٹیلہ پر شام تک بیٹھے رہے۔ ہاں کبھی کبھی وہ لوگ دونوں پہاڑ پر واقع دھرم استھان کی طرف دیکھ لیتے تھے اور کبھی کبھی شہر کی طرف نظر اٹھاتے تھے''۔

شامو آج گھبرایا ہوا نہیں تھا۔ آج بکریوں نے دودھ بھی پورا دیا تھا لیکن شامو کی ماں اندیشوں کی شکار تھی۔ رات کے وقت اس نے اپنے شوہر سے یہ ماجرا کہہ سنایا۔ شوہر نے سن کر کہا۔ ''شامو کی ماں یہ پرلئے کی نشانی ہے۔ میں نے کتب چچا سے سنا ہے کہ جب کیامت آئے گی تو بہت لمبا لمبا آدمی پیدا ہوگا۔ گھبراؤ نہیں جاپ کرتی رہو۔ دیکھتی نہیں ہو شہر میں ایک بھائی دوسرے بھائی کو بس سے اتار اتار کر جبح کر رہا ہے''۔

لیکن شامو کی ماں کو اپنے شوہر کی بات سے اطمینان نہیں ہوا۔ دوسرے روز وہ اپنا کام پورا کر کے چپ چاپ اس پہاڑ پر چلی گئی جہاں سادھو مہاتما رہتے ہیں اور ان لوگوں سے اس نے یہ سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ایک سادھو جی نے کہا ''دھرم کرو، دھرم۔ تمہارے پتی نے ستیہ کہا ہے۔ پرلئے نجدیک ہے۔ یہ بھگوان رام اور سیتا ہیں جو ہمارے مندر میں بھگتوں کو آشیرواد دینے آتے ہیں اور آشیرواد دے کر اسی جگہ جا کر بیٹھ جاتے ہیں''۔

شامو کی ماں نے جب رات کے وقت اپنے شوہر کو ان دو آدمیوں کی کہانی سنائی تھی تو اس کے شوہر نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی تھی لیکن خود اسے بھی ساری رات نیند نہیں آئی تھی اور وہ بھی اسی سوچ میں پڑا رہا تھا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟

شہر جانے کی راہ آج آٹھ دن گذر جانے کے بعد بھی نہیں کھلی تھی۔ شامو کا باپ دن بھر گھر میں بیٹھا بیٹھا اپنی بیوی سے دین دھرم کی بات کرتا رہتا تھا یا بیتے دنوں کی کہانیاں دوہراتا رہتا تھا۔ آج جب اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی سویرے کہیں چلی گئی ہے تو اسے

بھی درگاہ کا خیال آیا اور وہ سیدھا اس پہاڑ پر چلا گیا جس پر مشہور بزرگ کی درگاہ بنی تھی۔

وہاں جا کر اس نے پیر صاحب کو بندگی عرض کی اور وہ ماجرا سنایا جو اس نے اپنی بیوی سے سنا تھا اور اس کی بیوی نے اپنے بیٹے سے سن رکھا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے تاثرات بھی پیر صاحب کے سامنے دہرائے۔

پیر صاحب نے روداد سن کر فرمایا۔ ''میاں صاحب تمہارے قطبؔ چچا ٹھیک کہا کرتے تھے۔ قیامت آنے والی ہے۔ وہ دراصل ہمارے پیر صاحب کے، پیر صاحب کے پیر صاحب ہیں۔ جو یہاں آنے والوں کی مرادیں پوری کرتے ہیں تمہیں بھی اگر کچھ مرادیں مانگنی ہوں تو یہاں آ کر کچھ نذر و نیاز کیا کرو''۔

شاموؔ شام کے وقت پھر وہی خبر لایا کہ وہ دونوں ٹھیک اسی طرح ایک ٹیلہ پر بیٹھے تھے اور بہت، زیادہ مایوس تھے۔ اور شاموؔ کے باپ نے شاموؔ کی ماں کو بتایا کہ آج شہر میں زبردست مارا ماری ہوئی۔ ضعیفوں اور بچوں کو قتل کیا گیا ہے۔ جوان عورتوں کی عزت لوٹی گئی ہے اور گھروں میں آگ لگائی گئی ہے۔ شاموؔ کی ماں نے اپنے شوہر کو بتایا کہ سادھو جی نے اسے دھرم کرم کرنے کو کہا ہے اور تب اس کے شوہر نے بھی اسے بتایا کہ اسے بھی پیر صاحب نے نذر و نیاز کرنے کو کہا ہے۔

شاموؔ کے باپ نے اپنی بیوی سے یہ بھی کہا کہ کل ہم لوگ پورے گاؤں والوں سے یہ بات کہہ دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم سبھوں کا کچھ بھلا اس میں ہو جائے۔ چنانچہ دوسری صبح شاموؔ کے باپ نے دروازہ دروازہ جا کر یہ بات سب سے کہہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے گاؤں کے لوگ اکٹھا ہو کر ان دو بوڑھے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگے۔ آخر یہ طئے پایا کہ ہم لوگ مل کر ان کے پاس چلیں اور ان سے ان کے دکھ کا سبب دریافت کریں۔

چنانچہ پورے گاؤں کے لوگ ان دونوں پہاڑیوں کے بیچ ٹیلہ کے پاس پہنچے جس پر وہ دونوں بوڑھے لوگ بیٹھے تھے۔ پہلے تو گاؤں والوں کو کچھ ہچکچاہٹ ہوئی لیکن آہستہ آہستہ ہچکچاہٹ کم ہوتی چلی گئی اور لوگ ان دونوں کے قریب سے قریب تر ہو گئے۔ جب یہ لوگ بالکل ان کے سامنے پہنچ گئے تو دونوں ضعیفوں نے اپنا چہرہ ان لوگوں کی جانب سے

پھیر لیا۔ گاؤں والوں نے دیکھا کہ ان دونوں کے جسم پر زخم کے ہزاروں نشان ہیں اور سب سے تازہ تازہ خون رِس رہا ہے۔ گاؤں والوں کو اچانک گمان گذرا کہ کہیں کسی ظالم نے ان ضعیفوں پر حملہ تو نہیں کر دیا تھا۔ اس لئے سارے لوگوں نے ان بوڑھوں کو دیکھا۔ تب کچھ لوگ گھوم کر ان دونوں کے سامنے چلے گئے۔ سامنے جاتے ہی دونوں بوڑھے جن میں یقیناً ایک مرد تھے اور ایک عورت کھڑے ہو گئے۔ تمام لوگوں نے دیکھا کہ ان کے سینے بری طرح زخمی ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔

گاؤں والوں نے پھر حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس لئے وہ سب لوگ یکبارگی ان کے پاؤں پر گر گئے اور کہنے لگے کہ ''ہمیں معاف کر دیا جائے۔ ہم لوگوں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا ہے اور ہمیں بتایا جائے کہ آپ لوگوں کو اس طرح کس ظالم نے زخموں سے چور کر دیا ہے''۔ اور تب بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ بیٹو اور بیٹیو! یہی بات میں تم لوگوں کو بتانا چاہتا تھا کہ تم ساری دنیا کے لوگ ہماری ہی اولاد ہو۔ ہمارے پہلے دو بیٹوں میں سے ایک بیٹے نے ہمارے دوسرے بیٹے کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ میرا مقتول بیٹا نہایت شریف تھا اور دوسرا قاتل، ناہنجار اور لفنگا تھا۔ اسی دن سے ہم لوگ اپنے اس ناہنجار بیٹے سے دکھی ہیں۔ ہم لوگ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج بھی ہمارا وہی ناہنجار بیٹا ہمارے سارے شریف بیٹوں کو اور ان کے اہل و عیال کو ناحق قتل کرتا پھر رہا ہے۔ جگہ بدل بدل کر قتل کا یہ سلسلہ ہر روز جاری ہے لیکن ان ناہنجاروں کو یہ نہیں معلوم کہ ان کا ہر وار ہمارے سینے پر آکر لگتا ہے اور یہ بھی سن لو کہ ایسے ناہنجار بیٹے تعداد میں کم ہیں۔ تم میں سے کوئی شخص ہمت کر کے اسے پکڑ لائے تا کہ وہ ہمارا یہ لہولہان جسم دیکھ سکے۔ یہ کہہ کر دونوں ضعیف پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور گاؤں کے سارے لوگ وہاں سے روتے ہوئے اس بوڑھے آدمی کے چند ناہنجار بیٹوں کو ڈھونڈھنے کے لئے شہر کی طرف چل پڑے کہ جہاں ان کا صدر دفتر تھا.........اور جہاں دس دنوں سے مستقل کرفیو لگا تھا۔

(منشورہ مطبوعہ)

☆☆

وَقِنَا عَذَابَ النَّار

پوری فضا نالہ وشیون سے بھر گئی تھی۔ ایک طرف عورتوں کا غول در غول تھا جو پکار کر کسی مددگار کو بلا رہا تھا۔ لیکن ان کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہ تھا۔ فضا ان کی گریہ وزاری سے بھر گئی تھی۔ بھی حیوانات دم بخود تھے چاند کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ تاروں کی روشنی مدھم سے مدھم تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

سورج کی گرمی روح کو تڑپا دینے والی بنتی جا رہی تھی۔ یہ عورتیں پکار پکار کر کہتیں کہ کوئی آ کر مجھے بچائے کہ میں پیدا ہوئی تھی کسی ایک مرد کے ساتھ باعزت زندگی گذارنے کے لئے آج میں ایک دو تو کیا انگنت مردوں کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہوں۔ یہ لوگ مجھے نوچ رہے ہیں۔ بھنبھوڑ رہے ہیں۔ میں پچلی جا رہی ہوں۔ زندگی کرب والم کا شکار بنی ہوئی ہے۔ کوئی تو ہو جو مجھے بچائے۔ میری عفت و عصمت کو تحفظ عطا کرے۔ مجھے گھر کی دیوی بنائے۔ مجھے جینے کے مواقع عنایت کرے۔ مجھ سے زندگی کا ہنر سیکھے میں نسلوں کی محافظ ہوں لیکن یہ ذمہ داری ادا کرنے کی بجائے صرف ایک سواری بن گئی ہوں جس کی رکاب پر لوگ چند منٹوں کے لئے ٹھہرتے ہیں اور اتر کر مجھے بدن کی کسک اور اینٹھن دے جاتے ہیں۔

دیکھو اے آسمان کے تارو! رات کے اندھیرے میں کون کون لوگ اور کتنے لوگ میرے گھر آتے ہیں اور صبح کی صباحت پھیلنے سے پہلے سب کے سب رخصت ہو جاتے ہیں۔ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہوتا جسے میں اپنا کہہ سکوں جس پر میں اپنا حق جتا سکوں۔ جس پر ناز کر سکوں، جس کے لئے میں محبوبہ بن سکوں اور جو میرے سامنے جھک کر میرے حسن و جمال کی مجھے داد دے۔ جو کوئی آتا ہے کچھ دیر کی رفاقت کی جلن دے کر چلا جاتا ہے۔ اے ستارو! میری فریاد تم ہی سن لو کہ تم ان انسانوں کی طرح بے رحم نہیں۔ ستارے سنتے

تھے دیکھتے تھے لیکن کچھ کہنے سے مجبور تھے البتہ ان کا چہرہ روز بہ روز زرد ہوتا چلا جارہا تھا۔

چاند کا چہرہ اس وقت مدقوق ہو جاتا جب مٹی تلے دبی ہوئی معصوم، دوشیزہ روحیں چیخ چیخ کر یہ کہتیں کہ اے میرے باپ! میں نے تمہارا کیا بگاڑا کہ تم نے مجھ سے جینے کا حق چھین لیا۔؟

اے میرے باپ میری ماں سے اگر تم نے محبت نہ کی ہوتی اور اس محبت کو عملی شکل عطا نہ کیا ہوتا تو میں کیوں جنم لیتی؟ اے میرے باپ! میری ماں نے اتنی ہی اذیتیں میری پیدائش کے لئے جھیلی تھیں جتنی میرے بھائیوں کے لئے اسے جھیلنی پڑتی تھیں۔ پھر یہ کیا کہ میرا بھائی دنیا میں پھلے پھولے اور میرے لئے عرصۂ حیات تنگ ہو جائے؟

اے میرے باپ! اگر میں تمہارے پاس رہتی تو تمہاری خدمت کرتی، تمہیں اچھا اچھا کھانا پکا کر کھلایا کرتی۔ جب تمہارے سر میں درد ہوتا تو میں تمہارے سر میں تیل ڈالتی کہ تمہیں اس درد سے نجات مل جاتی اور تم آرام کی نیند سو جاتے۔

اے میرے باپ! یہ تمہیں کیا ہوا۔؟ وہ کون سی عزت و ناموس تھی کہ میری پیدائش نے اسے خاک میں ملا دیا تھا۔؟ اے چاند! میرا باپ مجھے اس کا جواب نہ دے سکے گا کہ اگر وہ اس کا جواب سمجھ پاتا تو وہ مجھے مٹی تلے تڑپتا نہ چھوڑ جاتا۔ میں کہ دنیا کے لبوں کو مسکراہٹ کا پیغام دینے والی ہوں۔ میں ہاں! وہی میں۔ مٹی کے تلے گھٹ گھٹ کر دم توڑتی چلی آرہی ہوں۔

اے چاند! تم ہی بتاؤ کہ میرا قصور کیا ہے؟ جس کی اتنی اندوہناک سزا مجھ کو دی جا رہی ہے اور یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔؟

چاند۔ بے چارہ چاند۔ بے زبان چاند۔ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس معصوم چیخ سے اس کا کلیجہ پھٹ گیا تھا لیکن وہ خاموش تھا کہ اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

بادِ نسیم اس وقت دم بخود ہو جاتی تھی جب وہ یہ دیکھتی کہ وہ پھول سے کومل بچے جن کے والدین ان سے رخصت ہو گئے ہیں کل تک جو ناز و نعم کے حقدار تھے آج در بہ در کی زندگی گذارنے کو مجبور ہیں۔ جنہیں اپنے باپ، دادا کے خرمن سے ایک خوشہ بھی چکھنے کو نہیں مل پاتا۔ جو باعزت زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو انہیں غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ لعنت و

شماتت، ڈانٹ پھٹکار، ذلت وخواری جن کا مقدر بنا ہوا ہے۔ یہ بچے جب پوچھتے ہیں کہ اے بادِنسیم! کیا شگفتگی میرے حصے میں نہیں؟ میرے والدین مجھ کو چھوڑ کر چلے گئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟ کیا اتنے سارے باپ اور ماں میں سے کوئی ایک بھی اس روئے زمین پر ایسا نہیں جو میرا باپ بن سکے، جو شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھ سکے۔ جو چھاتی سے لپٹا کر مجھے۔ ''اے میرے بیٹے''۔ کہہ سکے۔ میری سسکیاں اور میری آہیں اس بھری پری کائنات میں کون سنے گا۔؟ اے بادِنسیم! کچھ تو کہو۔ میرے لئے تم بھی تو کم از کم بادِنو بہار بن جاؤ لیکن بادِنسیم تھرّا کر رہ جاتی اور چپکے سے چمن کے کسی گوشہ میں منہ چھپا لیتی کہ وہ خود مجبور محض تھی۔!

اور تب! فضا میں ان عورتوں کی آواز بلند ہوئی جن کے شوہر انہیں چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے زیرِ خاک روپوش ہو گئے تھے۔

ان عورتوں نے سرو اور صنوبر سے پوچھا کہ کیا تم بھی مجھے سایہ نہ دو گے؟ یہ دیکھو کہ میں ابھی بالکل جوان ہوں۔ میرے جسم گدرائے ہیں، میرے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی ہے۔ میرے جوبن پر نکھار کا موسم باقی ہے میں نے بہار کی دنیا میں ابھی قدم رکھا ہی تھا کہ میری بہار مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ تو کیا پھر دوبارا میری زندگی میں بہار لوٹ کر نہیں آسکتی۔؟

کیا کوئی دوسرا مرد دوسری مرتبہ مجھ کو ''جانِ من'' کہہ کر نہیں پکار سکتا ہے؟

یہ دیکھو۔ یہ دیکھو! شادیانے بجنے کا وقت آیا ہے تو گھر والے مجھ کو گھسیٹ کر کال کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لئے جا رہے ہیں کہ میرا سایہ بھی ان کے لئے مکروہ اور منحوس ہے۔ بتاؤ کہ کل تک میں سہاگن تھی تو کسی کے لئے منحوس نہ تھی اور جب میرا شوہر مجھ سے چھن گیا ہے تو میں۔ وہی میں۔ آج منحوس ہو گئی ہوں۔

اے سایہ دار درختو! تم تو اپنے پاس آنے والی ہر ذی روح کو ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتے ہو۔ تم یہ نہیں کہتے کہ تمہارا سایہ کس کے لئے مکروہ ہے اور کس کے لئے محفوظ۔ پھر یہ انسانی سماج کے لوگ ایسا کیوں کرتے چلے آرہے ہیں۔؟

اے درختو! کہو۔ کچھ تو کہو۔ لیکن۔ کوئی جواب نہ دیتا۔ اے کاش ان درختوں کو

زبان ہوتی۔

آہ وبکا کے اس جم غفیر میں ایک بڑا گروہ ان مقہوروں کا بھی تھا جو غلام ابن غلام تھے اور جو زبردستوں کی لاٹھی کو جھک جھک کر سلام کرتے چلے آرہے تھے۔ جانوروں کی طرح جینے والے یہ لوگ جب آقاؤں کے چابک سے بلبلاتے تو آقاؤں کے بلند ہوتے ہوئے قہقہے فضا میں گونجتے۔

جب ہفتوں کا بھوکا شیر انہیں کے جیسے ہزاروں تماشہ بینوں کے سامنے پھاڑ پھاڑ کر ان کے گوشت کھا جاتا تو گردوپیش میں کھڑے یہ ہزاروں انسان تالیاں بجا بجا کر ان آقاؤں کی ہمت بڑھاتے۔ ان کے ظلم اور ان کی درندہ مزاجی کی داد دیتے۔ جنہیں مالکِ حیات وممات ہونے کا غلط گمان ہوا کرتا تھا۔

جب شعلہ گیر مادہ زفت مل کر ان غلاموں کے جسم میں آگ لگادی جاتی اور شعلوں کی لپیٹ میں آیا ہوا ابن آدم تڑپ رہا ہوتا تو اس وقت آسمان کے بادل بھی منہ چھپا کر بھاگ جاتے۔ اس وقت شعلوں میں لپٹے ہوئے یہ انسان آسمان کی جانب بیکسی بھری نظریں اٹھا کر دیکھتے اور آسمان سے پوچھتے کہ تو کیوں نہیں پھٹ پڑتا ہے؟

لیکن آسمان جس کے نیچے ایسے تماشوں کو جنم لینا ہے اپنی زبان خاموش سے بس یہ کہتا۔ ع چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

سفر۔ سفر ہی سفر۔ بے نیل ومرام سفر۔ بے منزل اور بے شام سفر۔ آزمائش اور ابتلاؤں سے پر آشام سفر جاری تھا۔

یکا یک خدا نمبر ایک کو رحم آگیا اور اس نے ایک ایسی شخصیت کو اس تڑپتی اور بلکتی ہوئی انسانی آبادی کے درمیان سے کھڑا کر دیا جس نے آکر یہ بتایا کہ روز ازل میں خدا صرف اور صرف ایک تھا جو لَم یَلِدْ وَلَم یُولَدْ تھا۔ جس نے صرف ایک آدم کو پیدا کیا تھا۔ یہ اکیلا آدمی اسی خدا نمبر ایک کی کرشمہ سازی سے زوج میں بدلا اور تب دھیرے دھیرے اس کی وحدت نے کثرت کی شکل اختیار کی۔ جب سے آدم کی یہ وحدت کثرت میں بدلی تو اس کثرت نے خدا نمبر ایک کے بعد خدا نمبر دو، تین، چار، پانچ اور اس طرح حسب ضرورت

انگنت خداؤں کو پیدا کرلیا۔

خدا نمبر ایک کے بعد پیدا ہونے والے انہیں خداؤں نے یہ قوانین وضع کر لئے جس کی زد پر تم تمام لوگ ہو۔

کان کھول کر سن لو کہ میں تمہارے ہی درمیان سے اس خدا نمبر ایک کے ذریعہ اٹھایا گیا ہوں تا کہ تمہیں دکھ درد سے نکال کر سکھ چین کی دنیا میں پہنچادوں۔ یاد رکھو! کہ یہ کثیر تعداد خداوند خود بھی ایک دن بھیانک انجام سے دوچار ہوں گے۔ اور وہ ایک دن عنقریب آنے والا ہے۔

تم حراساں نہ ہو۔ اب میں آگیا ہوں۔ میں ان سارے وحشیوں کو انسانیت کا سبق پڑھاؤں گا۔ اے مظلوم لوگو! تم میرے ساتھ آجاؤ میرے سایہ میں آجاؤ۔ ان ظالموں کے برے دن بہت جلد آجائیں گے۔ وہ دن وہ ہوگا کہ جب تم عیش و مستی کے دن کاٹ رہے ہوگے اور یہ سارے ظالم لوگ تمہارے سامنے تڑپ رہے ہوں گے۔ بلبلا رہے ہوں گے۔ لیکن ان کا نالہ وشیون سننے والا کوئی نہ ہوگا کہ اس کے بعد پھر کوئی ایسا دن آنے والا نہیں کہ جب کوئی کسی انجام سے دوچار ہو۔

تو اے مظلوم و مقہور لوگو! آؤ! میرے ساتھ آؤ۔ لوٹ چلو اس خدا نمبر ایک کی طرف کہ وہی اور صرف وہی سارے دکھیوں کا سہارا ہے۔ اور تب ایک بار پھر یہ ہوا کہ وہ پوری فضا جو نالہ وشیون سے بھری تھی اور جس کے بیچ بیچ میں قہقہے۔ ہیبت ناک قہقہے بلند ہوا کرتے تھے۔ پکار پکار کر کہنے لگی۔

وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ
وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

پٹنہ ریڈیو سے نشر اور ''انتخاب'' بنگلہ دیش میں مطبوعہ

☆☆

روشنی بکھرنے دو

خون بھری ستلج اور جمنا میں ڈوبتا ابھرتا بلجیت جب ساحل سے ٹکرایا تو اس کی آنکھ کھلی اور اس نے دیکھا کہ وہ جمنا کے کنارے اس آباد شہر میں پہنچ چکا ہے جس کے ذرّہ ذرّہ میں ایک کہانی ہے۔ جس کا چپّہ چپّہ تاریخ کا ایک باب ہے، جو شاعروں کے تخیل کی بلند ترین منزل ہے۔ جو حسن و رعنائی کا پیکر مجسم ہے، جو تہذیب اور شائستگی، علم و ہنر، فکر و نظر کا حسین مرقع ہے۔

اس کے تصور کی دنیا کا ایک حصہ آصف علی روڈ اب اس کا مستقر تھا۔ بلجیت ایک ہنرمند نوجوان تھا جو ہنرمندی کی کئی اعزازی سند حاصل کر چکا تھا اور جسے اپنی ہنرمندی پر فخر بھی تھا۔ اور فخر ہو بھی کیوں نہیں۔؟ یہ اس کی اپنی محنت ہی تو تھی کہ انارکلی روڈ پر اسے ایک خوبصورت سا فلیٹ نصیب ہوا تھا۔ جس میں زندگی کی ساری آسائشیں بھری ہوئی تھیں جہاں اس کے والدین تھے۔ بھائی بند تھے۔ پھر ان دونوں ندیوں میں ایسا ابال آیا کہ سب کچھ تہس نہس ہو گیا۔ ان دونوں ندیوں کے ساحل پر بسے تمام لوگ اس طغیانی کی زد میں آ گئے۔ بلجیت نے بھی دونوں ندیوں میں خوب خوب غوطہ کھایا اور اس غوطہ زنی کے بعد وہ سب کچھ بھول گیا۔

بلجیت کو اب قطعی یاد نہیں تھا کہ اس کے پاس ایک خوبصورت سا محل تھا۔ پیار و محبت کے پھول نچھاور کرنے والے والدین تھے۔ چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ زندگی کی مسرتیں تھیں۔ سکھ تھا، چین تھا۔

اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ اوباش اور عیاش نوجوان تھا یا متقی اور پرہیزگار تھا اس نے اپنی زندگی میں جو سبق سیکھا تھا وہ صرف یہی تھا کہ زندگی عزم مصمم اور عمل پیہم کا دوسرا

نام ہے۔

آصف علی روڈ کا بلجیت اب صرف ایک میکنک تھا جو شب و روز محنت کر رہا تھا کچھ دن بعد بلجیت ایک چھوٹی سی دکان کا مالک تھا جس میں ڈریلنگ اور کٹنگ کی چند مشینیں لگی تھیں اور اس کے بعد بلجیت ایک کارخانہ کا مالک تھا جس کے پاس لاکھوں روپے ہو چکے تھے۔ ایک بار پھر وہ ایک عالی شان بنگلہ کا مالک بن چکا تھا۔

انارکلی سے آصف علی روڈ کی مسافت کی تھکن بھول کر بلجیت کو اب ایک عام کاریگر سے کارخانہ دار کا سفر یاد تھا ان دونوں کے فرق پر اس کی گہری نگاہ تھی۔

بلجیت اب نہ صرف اپنے محلّہ کا ایک معزز فرد بن چکا تھا بلکہ شہر کے اکثر ہنگاموں میں اس کی شمولیت لازمی ہو گئی تھی۔ ہنگاموں کی نوعیت خواہ ادبی ہو یا ثقافتی، تہذیبی ہو یا تفریحی، علمی ہو یا غیر علمی۔

بلجیت کا گھر پہلے چند سر پھرے نوجوانوں نے دیکھا تھا جنہیں چھوٹے موٹے گانے بجانے کی محفل کا اہتمام ہو یا کھیل کود کرانے کے لئے ہلکے پھلکے چندہ کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اکثر ایسے موقعوں پر بلجیت تنہا کریڈٹ لے جاتا۔ لڑکوں کو دوسرا در کھٹکھٹانے کی حاجت بھی نہیں ہوتی۔ بلجیت کے کردار کا یہ رخ دن بہ دن نمایاں ہونے لگا۔ نتیجتاً شہر کے معززین، افسران اور وزراء کی نگاہ کرم بھی بلجیت پر پڑنے لگی۔

بلجیت انارکلی روڈ کا اناڑی، خوابوں کے محل کا نواسی بن گیا۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے حسین سپنے دیکھنے لگا۔ سپنوں کی دنیا کا بلجیت کاریگر بلجیت سے بالکل مختلف ہو گیا۔ بڑی بڑی محفلوں کے دعوت نامے اس کے ٹیبل پر پڑے اس کی توجہ کے محتاج بن گئے۔ بلجیت بلا تفریق ہر قسم کی دعوت قبول کرنے لگا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ وہ دعوت نامے قیمتی ہوں اور چشم براہ دولت مند لوگ ہوں یا حکام شہر۔

جمنا کے ساحل سے ٹکرانے والا بلجیت ستائیس برس کا تھا۔ آصف علی روڈ نے اسے دس برس اور عطا کر دیا تھا۔ ان دس برسوں میں بلجیت جمنا کی سطح سے اچھل کر گنبد نیلوفری کی طرف سرگرم سفر تھا۔ رات اور دن کارخانہ کی الجھن یا محفلوں کی سرمستی۔ ان دو متضاد مشاغل

نے بلجیت کو کچھ سوچنے کی مہلت نہ دی۔ ہاں اگر اسے کبھی مہلت ملتی تو وہ صرف اس قدر سوچ لیتا کہ اب اس کے اشارۂ ابرو پر زمانہ سجدہ ریزی کو تیار ہے۔ مہ لقا اور ماہ پارہ اس کے ہاتھوں کا میل بن چکی تھی۔ عیش ونشاط کی محفلوں میں بوتلوں پر بوتلیں لنڈھا دینا اب اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل بن چکا تھا اور اب اسے قطعی یہ احساس نہیں رہا کہ وہ خون کی ندیوں میں غوطہ زنی کر چکا ہے۔ وہ یہ بھول گیا کہ اس کے والدین نے اسے جس معاشرہ میں پالا پوسا تھا وہاں یہ چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ پرائی عورت کو ہاتھ لگانا۔ معاذ اللہ۔ اس پر ہوس بھری نگاہ اٹھانا بھی جرم اور گناہ تھا۔ ناؤنوش یہ تو بہت بڑا اخلاقی جرم اور گناہ کبیرہ تھا۔

اسے اگر کچھ یاد رہا تھا تو وہ تھیں چمکتی تلواریں، خون کے اچھلتے فوارے۔ خاک اور خون میں لوٹتا انسان اور درندہ صفت پڑوسی۔ راستہ۔ جسے امن وامان کا مسکن سمجھ کر وہ چل پڑا تھا۔ وہ بھی ایسا ہی پُر خطر نظر آیا۔ وہی تصویر۔ وہی انداز وہی کردار اور وہی پیکار۔ اس وقتی حادثہ نے اس پر گہرا اثر چھوڑا تھا جب کہ اس کی ابتدائی تعلیم نے اسے کچھ بھی یاد رکھنے کو مجبور نہ کیا۔

بلجیت ناؤنوش میں سرگرم ہوگیا۔ حسن اس کے قدموں میں نچھاور ہونے لگا۔ اسی چہل پہل میں اسے ایک دن اچانک خیال آیا۔ یہ کارخانہ، یہ دولت کس کے کام آئے گی؟ نہ والدین رہے، نہ بھائی بہن۔ آج میں ان کے سہارے دوسروں کی عصمت وعفت لوٹ رہا ہوں۔ کل میری یہ ساری دولت کوئی لوٹ لے گا اور خیال اسے روز بروز بے چین سے بے چین تر کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی کی وہ حسین شام آگئی جب انہیں میں سے ایک پر بلجیت کی نگاہ انتخاب ٹھہر گئی اور روشنا چھوئی موئی بنی اس کے محل میں داخل ہوگئی اور اس کی زندگی کا جزو بن گئی۔ روشنا پیار اور محبت کا ایک چلتا پھرتا مجسمہ تھی۔ بلجیت ٹوٹ کر اسے چاہنے لگا۔ اب روشنا اس کی تقدیر بھی تھی اور اس کے خوابوں کی زندہ تصویر بھی۔ ایک برس بیت گیا۔ بلجیت بالکل بھول گیا کہ وہ کبھی عیش ومسرت کی محفلوں کا شاہزادہ تھا۔ اب اس کی زندگی کا مقصد روشنا کی نگاہوں سے پینا اور اس کے تصور میں جینا بن گیا تھا۔

پورا ایک سال گذر گیا۔ یہ پورا سال کیسے گذرا؟ بلجیت یہ نہیں سمجھ سکا۔ اسے اس

دن ہوش آیا جب وہ نرسنگ ہوم سے روشنا کو سفید لباس پہنا کر باہر نکلا اور گود میں اس کی یادگار ننھی منّی سی پیار بھری تصویر لئے اپنے اسی محل میں داخل ہو گیا۔ کل جس محل میں روشنا کی وجہ سے چہل پہل تھی، چمک دمک تھی، آج اس چہکتے مہکتے محل میں صرف ایک معصوم سی چیخ تھی جو ماں کی یاد میں بار بار بلند ہو رہی تھی۔

گھر آنے کے بعد بلجیت نے اس ننھی سی تصویر سے سب سے پہلا سوال یہی کیا کہ۔ ''روشنا کیا میری تقدیر میں صرف چند دنوں کا اجالا تھا۔؟ یہ ایک سال میرے لئے ایک رات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کل تک تمہاری ماں کے ساتھ میرے اسی گھر میں خوشیوں بھری چہل پہل تھی اور آج اس کے بغیر تمہاری معصومیت بھری چیخ ہے اور ڈھونڈھتی نگاہیں ہیں۔''

ننھی سی اس تصویر نے مسکرا کر کہا۔ تم اگر چاہو تو میں ہمیشہ تمہیں روشنی عطا کروں۔ میں روشنا کا بدل ہوں لیکن تم ایسا نہیں چاہو گے تمہیں ماضی یاد نہیں رہتا۔ ماضی کو بھولنے والے کا مستقبل ہمیشہ بھٹکتا رہتا ہے۔

بلجیت نے اس ننھی سی پیکر جمیل سے پوچھا۔ ''تم روشنا کا بدل ہو۔''؟ پھر بڑے پیار سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کا نام بھی روشنا رکھ دیا۔

کل روشنا اس کی بیوی تھی۔!

آج روشنا اس کی بیٹی ہے۔!!

آج کی روشنا ضعیف دایہ کی گود میں پلنے لگی..........

کارخانہ دار بلجیت ایک بار پھر چند دنوں کے بعد ہی یہ بھول گیا کہ وہ کاریگر بلجیت سے کارخانہ دار بلجیت بنا تھا اور اس نے انار کلی روڈ سے آصف علی روڈ تک کا سفر طئے کیا تھا۔

خوبصورت دعوت نامے پھر آنے لگے۔ بلجیت کی کار نائٹ کلب اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کے پورٹیکو میں کھڑی ہونے لگی۔ بلجیت ایک بار پھر بوتلوں سے اپنا قد ناپنے لگا۔

آج کی روشنا قدم بہ قدم چلتی ہوئی شباب کی منزل میں داخل ہو گئی۔ ''مس کالج''۔ کا خطاب پا کر جس رات وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بلجیت ڈرائنگ روم کے صوفے پر اوندھا پڑا ہے۔ بوتلوں کے ڈھکن کھلے پڑے ہیں۔ اسے باپ کی یہ حالت

دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا۔اس نے بلجیت کا کاندھا پکڑا۔سہارا دے کر وہ اسے اس کے بیڈ روم تک لے گئی اور آہستگی سے اس نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔لتا کر وہ جیسے ہی مڑی اس نے دیکھا کہ بلجیت اس کی کلائی کو زور سے پکڑ چکا ہے اور بدمستی کے عالم میں بک رہا ہے۔

''روشنا میری روح.........آج کی رات مجھے چھوڑ کر نہ جا.........میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..............''۔

روشنا نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔اس نے بلجیت کو ہوش میں لانا چاہا اور اس کے لئے اس نے بلجیت کے چہرے پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

طمانچہ کھا کر بلجیت کا بوڑھا خون جوش میں آ گیا۔وہ اسے برداشت نہیں کر سکا۔ چٹاخ کی آواز ابھی پھیلی ہی تھی کہ بلجیت کی کمر میں لٹکا خنجر روشنا کے جگر کو چھید گیا۔روشنا دھڑام سے زمین پر گری۔اور تب بلجیت کا ہوش واپس آ گیا۔

اس کی زبان سے ایک چیخ ابھری۔ روشنا۔روشنا۔میری بیٹی ۔اور روشنا میری بیٹی ۔کی چیخ سے پورا محل گونج اٹھا۔

بوڑھی ماما روشنا کے پاؤں کے پاس پڑے بدنصیب بلجیت کو کھڑی دیکھتی رہ گئی۔

پٹنہ ریڈیو سے نشر

اور مطبوعہ ''آواز'' دہلی

☆☆

ہمت کا مسافر

احسن لطف اللہ ایک طویل نام تھا جسے پیار سے مختصر کر کے لطفی بنا دیا تھا۔ پیار کی یہی ستم ظریفی ہے جو عام طور پر بوالعجبی بنی رہتی ہے۔ یہ کبھی اس قدر پھیل جاتا ہے کہ حیات و کائنات اس کے دامن میں پناہ لے لے اور کبھی اتنا سکڑ جاتا ہے کہ نام کی وسعت بھی برداشت نہ کر سکے۔ لطفی ایک مختصر نام تھا جو پیار کی یادگار کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس اختصار میں جہاں بھر کی کشادگی محصور تھی۔ ایم۔اے۔ میں ٹاپ نہ کر سکنے کے فوراً بعد لطفی کا ہائی اسکول میں ملازمت اختیار کر لینا اس کے احباب کو بیحد گراں گذرا تھا۔ پیار کے پیکر دوستوں نے کہا تھا کہ وہ کسی دوسرے سبجکٹ میں ایک بار پھر امتحان دے ضرور ٹاپ کرے گا۔ لیکن لطفی خود کو اس کے لئے تیار نہ کر سکا۔ چنانچہ اسکول میں معلمی کرنے کے لئے اس نے اپنے آپ کو اسکول کی چہار دیواری میں داخل کر لیا۔ ملازمت کے چند دن بعد ہی ہر زبان پر اس کا چرچا اس کی کامیابی کا پہلا قدم تھا۔ رازداں بیگم اس اسکول میں شعبۂ اردو کی تنہا معلمہ تھیں جو انگنت ہنگامہ خیزیوں کی تمنا لئے خاموش اور پر سکون زندگی گذار رہی تھیں۔ صنفی تقاضے کے تحت تنہا کچھ کرنے سے معذور تھیں۔ وہ متلاشی تھیں کسی ایسی ذات کی جس کی معیت میں کچھ کیا جا سکے۔ لطفی کا اسکول کی ملازمت میں داخل ہونا شروع شروع میں انہیں اچھا نہ لگا صرف اس لئے کہ لطفی کی رعنائی اور دلکشی اسکول کے ماحول کو مرتعش کر سکتی تھی اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ اسکول کی تقریباً تمام معلمہ اس کی گرویدہ وشیدا ہو گئیں۔ طالبات میں لطفی صاحب کا ذکر انتہائی شدّ ومد سے ہونے لگا ہر کوئی ''بھائی جان'' کا تذکرہ کر کے ہی اپنے آپ کو مسرور کرنے پر مجبور تھی۔ اسکول کھلنے کے چند ماہ بعد بزم ادب کا سالانہ جلسہ کرنے کی نوبت آئی تو رازداں بیگم نے ایک بار پھر خود کو تنہا محسوس کیا۔ مجبوراً لطفی پر ان کی نگاہ پڑی جواب تک اسکول کی

تمام سوسائٹیوں کا رکن بن چکا تھا اور اپنی ذمہ داریاں بخوبی نباہ رہا تھا۔ راز داں بیگم نے ایک دن لطفی سے پوچھا ''آپ نے اپنا کیریر بنانے کے لئے کچھ دن انتظار کیوں نہیں کیا آپ کو کسی نہ کسی کالج میں ضرور جگہ مل جاتی''۔

''بیگم صاحبہ! وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ پھر میں وقت کا انتظار کیوں کرتا؟'' اس میں انتظار کی کون سی بات تھی۔ ہاں تھوڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی''۔ بیگم صاحبہ شاید آپ یہ بھول رہی ہیں کہ زندگی کا تلاطم خیز سمندر پار کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی ندیوں میں تیرنا سیکھنا پڑتا ہے۔ میں ان نوجوانوں کی طرح نہیں جو بلندی کا خواب دیکھتے ہیں لیکن پستی سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں رکھتے۔ بلندی کا راستہ پستی ہی سے ہو کر گذرتا ہے''۔

ان باتوں کے بعد راز دان بیگم کو لطفی کے کردار کا اندازہ ملنے لگا تھا اور اسی لئے بزم ادب میں ان کی شمولیت بیگم کے لئے ہچکچاہٹ کا سبب نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسکول کی تاریخ کا وہ حسین دن آ ہی گیا جب بزم ادب کے جلسہ کی تعریف میں شہر کا ہر ذی ہوش رطب اللسان تھا۔ دراصل وہی پہلا دن تھا جب لطفی نے مستقبل کے منصوبوں کا خاکہ عوام کے سامنے کھل کر رکھا تھا۔ عوام نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ان منصوبوں کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا جس سے لطفی کو سمجھنے کا کچھ اور موقع بھی ملا۔ بیگم صاحبہ لطفی کے خیالات سے قطعی طور پر متفق تھیں۔ انہیں شدید احساس تھا کہ انسانیت کچوکوں سے کراہ رہی ہے جو سیاست، معیشت اور ثقافت کے نام پر اسے لگائے گئے ہیں۔ ایک ہمہ گیر انقلاب کے بغیر انسانیت کی مسیحائی کرنا محال ہے لیکن انقلاب کی زد میں آنے والے جابروں اور ظالموں کے مقابلہ کے لئے ایک مردِ آہن کی ضرورت ہے۔ لطفی کلبلاتی انسانیت کی پرسکون سطح پر ابھرنے والا مرد میدان انہیں نظر آیا جو معاشرے کے ہر بدعنوان شخص کو احترام آدمیت کا سبق سکھانے میں مصروف تھا۔

لطفی اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ معاشرہ کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے افراد میں حیات نو کی روح پھونکنا ضروری ہے اور یہ روح اس وقت مناسب فضا میں بالیدگی حاصل کرے گی۔ جب انسانیت کا پہلا مکتب اخلاقیات کے رنگ و روغن سے مزین کر دیا

جائے گا۔ وہ یورپ کی طرح علم و ہنر کی روشنی پھیلا کر اپنے ظلمات کو بے چشمہ حیوان نہیں بنانا چاہتا تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی اپنی سرزمین ان تمام ثقافتوں کا سنگم ہے اور اس لئے اس سنگم پر وہ انقلاب کا نیا محل بنانے کے لئے مدرسۃ البنات کی بنیاد ڈال چکا تھا جس کے لئے اسے ہر چہار طرف سے خطیر رقمیں بھی مل رہی تھیں اور تحسین و آفرین بھی راز داں بے حد خجل تھیں۔ ان کا گھرانہ فلاکت زدہ تھا۔ بوڑھے والدین اور چند عزیز بھائیوں کی ذمہ داری لئے وہ شب و روز بے چین اور متردد زندگی گذار رہی تھیں۔ ذمہ داری کے اس بوجھ نے ان کے چہرے کی مسکراہٹ رہن رکھ لی تھی۔ لیکن ان ذمہ داریوں سے بھی بڑی ذمہ داری لطفی نے اس کے سر پر رکھ دی۔ مدرسۃ البنات کی ساری انتظامی ذمہ داری اس کے لئے کافی تھی کہ راز داں کو ضعیف و نزار کر دے لیکن لوگ حیران تھے کہ کل تک بجھی بجھی رہنے والی راز داں آج جوان تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ رعنائی و برنائی اس شام اپنے نقطۂ عروج کو پہونچ گئی جب راز داں شہر میں ایک نئے ثقافتی مرکز کا افتتاح کرتی ہوئی اعلان کر رہی تھی کہ لطفی صاحب کو اب ایک مالی ادارہ کھولنا ہے جو سود کی لعنتوں سے پاک ہو اور غریبوں کے لئے راحت رساں اس لئے ثقافتی مرکز کی ذمہ داری کوئی دوسرا شخص قبول کرے۔ اس خدمت کے لئے پیش کردہ ناموں کی طویل فہرست دیکھتے ہوئے لطفی بے حد خوش تھے اور یہ کہہ رہے تھے۔ ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

پٹنہ ریڈیو سے نشر
مطبوعہ ''آواز'' دہلی

غفورُ الرَّحیمِ

''اے خدا! تو غفور الرحیم ہے۔عفو اور در گذر تیرا شیوہ ہے۔تو میرے دوست پر رحم فرما''۔اس کی بیچارگی بھری گذارش کہ''میرے لئے دعا کرو''۔میری زبان سے یہ دعائیہ کلمات نکل پڑے۔اور تب میں نے دیکھا کہ میری آواز تو گلوگیر ہو ہی چکی تھی۔اس کی آنکھوں میں بھی نمی آ گئی۔انسان کتنا مختار ہے اور کتنا مجبور اس وقت یہ تماشہ دیدنی تھا۔آج بہت دن بعد جب میں اس سے ملا تھا تو اس کی مجبوریاں میرے کلیجے کو چھلنی کر رہی تھیں۔

میری اور اس کی دوستی ایک طویل مسافت طئے کر چکی تھی اس لئے آج زبان سے جب یہ دعا نکلی تو اس دعا نے تصور کو ایک طویل سفر کی جانب روانہ کر دیا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو جاننے کی کوشش کی تھی۔پیہم مجھے اپنے ہونے والے دوست کی خبریں ملا کرتی تھیں۔اس کی تعلیمی جدوجہد، ادبی سرگرمی اور سیاسی بھاگ دوڑ سے میں روشناس کرایا جاتا رہا تھا کہ پھر ہم دونوں آمنے سامنے آ کھڑے ہوئے۔بھرپور نگاہوں سے ایک دوسرے کا جائزہ لیا تھا اور پھر بغل گیر ہو گئے تھے۔تب سے اب تک ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہیں۔لیکن اس بغل گیری کے باوجود وہ فاصلہ برقرار رہا جو الگ الگ منزلوں کے حصول کی تمنا کا فاصلہ تھا۔

میرے دوست نے مجھ سے برخلاف جدوجہد کی وہ راہ اختیار کی جس سے خسروی حاصل ہوتی ہے۔انقلاب کا نعرہ لگا کر تاج وتخت کا حصول اس کی غرض وغایت بن گئی۔اس کی ادبی کاوشیں، اس کی سماجی خدمتیں اور اس کی تمام تر سرگرمیاں اسی غرض کے لئے مخصوص ہو گئیں۔مجھ سے کئی بار اس موضوع پر اس سے باتیں ہوئیں لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے۔میں اس موقف پر قائم رہا کہ تمام تر جدوجہد کا اصل نتیجہ ابدی نتیجہ

کی شکل میں ملنے والا ہے اور اس نے نتائج کا انتظار اسی دنیا میں کیا۔

مجھے اس کا اعتراف کر لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی کہ میں بظاہر ناکام رہا اور میرے دوست کو بہت ساری کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ یہ مان لینے میں بھی میں خود کو بونا محسوس نہیں کرتا کہ میرے دوست نے زیادہ احباب حاصل کئے، زیادہ احترام حاصل کیا اور زیادہ پیروکار اسے ملتے رہے جو کھلے اور چھپے اس کے کاز میں شریک ہوتے رہے ہیں اور اس کے مقاصد کے حصول میں دل جمعی سے لگے ہیں۔ اس کی ان کامیابیوں نے اسے کبھی یہ سوچنے کی مہلت نہ دی کہ ''غربت سے پہلے دولت کی قدر کرو اور علالت سے پہلے صحت کی قدر کرو''۔ اس کے دل میں یہ بات کبھی جگہ نہ پا سکی کہ ''وہی بیمار ڈالتا ہے اور وہی پھر اچھا کر دیتا ہے''۔ بظاہر اس نے مجھ سے کبھی اختلاف نہ کیا لیکن حقیقتاً وہ اس سے منحرف رہا۔ اس کی تمام تر جدوجہد نے جس مقصد کو اولیت دی وہ الحادی قوتوں کو تعاون دینے کی تھی۔ اس کے لئے یہ عمل سب سے افضل اور اعلیٰ تھا۔ اس نے کئی ایسے شاگردوں کو جنم دیا جو انسانی آبادیوں میں گھوم گھوم کر ناخواندہ اور کم فہم لوگوں میں ان سیاہ افکار کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ خدا بیزاری اور گمرہی جس کا دوسرا نام ہے۔ تصور کے سبز باغ دکھا دکھا کر قہر و جبروت کی وادی میں ہانک ہانک کر خدا کے ان معصوم بندوں کو لے جانا جن کا شعار بنا ہوا ہے۔

ایک وہ وقت تھا جب میرا وہ دوست جوان رعنا تھا۔ اس کی رگوں میں اچھلتا خون بروقت اسے متحرک رکھتا تھا۔ اس کی فکر کے قلزم سے ذہنوں کو سیرابی حاصل ہو رہی تھی۔ لیکن.. صد حیف کہ اس شیو کی جٹا سے جتنی ندیاں نکلیں ان تمام ندیوں نے اجگر کا وِش اپنے ساتھ لایا.. وِش کے کئی ایسے درخت خدا کی زمین کے مختلف حصوں میں اس نے نصب کر دیئے جو آج بار آور ہو چکے ہیں۔ ان کے خوشنما پھل اب بازاروں میں کھلے عام بکنے لگے ہیں۔ اندھیرا دن بہ دن پھیل رہا ہے۔ روشنی کے لئے آزمائش اور چیلنج میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں یہ نئی مانتا کہ روشنی ماند پڑ جائے گی یا روشنی پھیلانے والے چراغ گل ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ ان روشنیوں کو فی الوقت لہلہاتے سبزہ زاروں اور سکون بخش شبستانوں کے بدلے سرخ پتھروں کی وادیاں مل رہی ہیں۔ ان پتھروں کو سفیدی اور لہلہاہٹ عطا

کرنے میں میرے دوست اور اس کے پیروؤں کی تمام تر صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں۔ کاش روشنی کی ان کرنوں کو ضائع ہونے سے بچایا جاتا۔ اور میرے دوست نے اس سلسلہ میں میری مدد کی ہوتی۔

آج جب کہ پکڑنے والے نے اسے پکڑ لیا ہے اور اس کی گرفت سے آزادی پانے کے لئے اس کے حضور سفارشیں پیش کی جارہی ہیں اور اس آزادی دینے والے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو اس تصور سے بھی روح کانپ رہی ہے کہ نہ جانے کب اس کی گرفت میں کون آجائے۔؟

مجھے یقین ہے خدا! وحدہٗ لاشریک خدا۔ میرے دوست پر ضرور رحم فرمائے گا اس لئے کہ وہ غفور الرحیم بھی ہے اور عفوودرگذر کرنے والا بھی ہے۔

ہاں! شاید وہ اس دن کا منتظر ہے جب اس کی جٹا سے نکلنے والی وِش بھری ندیوں کا رشتہ اس سے ٹوٹ جائے گا۔ یا پھر وِش بھرے خوش رنگ پھلوں کی پیدائش کا سلسلہ رک جائے گا۔ اور۔ تب میرا وہ دوست، میرا ازلی اور ابدی دوست بن چکا ہوگا۔ اس کی کھوئی ہوئی ساری دولتیں اسے مل چکی ہوں گی۔ اس کی ساری توانائیاں اسے لوٹا دی گئی ہوں گی اس کی نگاہیں اسے واپس مل گئی ہوں گی اور وہ حق کی روشنی پھیلانے میں لگ چکا ہوگا۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب سیاہی اس سے خوف زدہ ہونے لگے گی۔ اس کی جدوجہد کو نئی راہ اور نئی منزل حاصل ہو چکی ہوگی۔ وہ منزل جو ازلی ہے۔ وہ منزل جو ابدی ہے اور وہ منزل جو حقیقی اور اصلی ہے۔ اے میرے خدا تو رحم فرما کہ تو غفور الرحیم ہے۔ بیشک صرف تو ہی غفور الرحیم ہے۔!!!

منشورہ آکاشوانی پٹنہ

مطبوعہ پندرہ روزہ ''آواز'' دہلی

ڈائجسٹ۔ ''الحسنات'' ڈائجسٹ، رامپور

دسمبر ۱۹۸۴ء

وَتِلکَ الایّامُ نُداوِلُھا

راجندر شکلا اور ہرچرن سنگھ بڑار کی دوستی ایک مثالی دوستی تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ان دونوں فرقوں کے درمیان رسّہ کشی چل رہی تھی اور اس کی وجہ سے پوری فضاء روز بروز بوجھل سے بوجھل تر ہوتی چلی جارہی تھی۔ یہ دونوں ایک ہی مکان میں دو بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ راجندر اور ہرچرن پچھلے آٹھ برس سے ایک بڑی موٹر گیرج کے مشترکہ مالک تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے احمد آباد کی ایک مشہور سڑک پر ہرچرن سنگھ بڑار کی ایک چھوٹی سی موٹر پارٹس کی دکان تھی اور راجندر شکلا اس دکان میں ملازم تھے۔ البتہ مالک اور ملازم ہونے کے باوجود باہم دوستوں کی طرح جی رہے تھے جس کا واحد سبب ان کا شغل ناؤ نوش اور فطرت عیش پرستی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ احمد آباد میں جو مہاتما گاندھی کا مادرِ وطن تھا فرقہ وارانہ منافرت کا مرکز بننے لگا۔ ہندوستان کی ایک تنگ نظر تنظیم نے اسے اپنا مرکز توجہ اور مستقر بنالیا۔ پھر اس تنظیم نے اپنے بال و پر نکالنے شروع کردیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ احمد آباد کمزوروں کے لئے ایک آزمائش گاہ بن گیا۔ آئے دن مکانات جلنے لگے، دکانیں لٹنے لگیں۔ کاروبار مندہ پڑنے لگا۔ انہیں حالات میں ہرچرن سنگھ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب احمد آباد سے نکل کر ہندوستان کے مرکز دہلی کو زندگی کا مرکز بنایا جائے۔ راجندر سنگھ شکلا نے بھی اس کی تائید کی اور دونوں اپنی دکان بڑھا کر احمد آباد سے دہلی منتقل ہوگئے۔

یہ نقل مکانی ہرچرن سنگھ کے لئے بہت سودمند ثابت ہوئی اس نے محسوس کیا کہ اس کے لئے دونوں جگہیں یکساں ہیں۔ البتہ راجندر شکلا کی پانچوں انگلیاں گھی میں چلی گئیں۔ دہلی پہونچ کر اس نے خود کو اور زیادہ مضبوط محسوس کیا۔ اس کے کئی رشتہ دار پہلے ہی اس شہر میں مختلف دھندھوں سے لگے تھے اور خوشحال تھے۔ ہرچرن نے حالات سے فوری سمجھوتہ کیا اور شکلا کو اپنا شریک تجارت بنالیا۔ یہی نہیں بلکہ دونوں نے دکان کی بجائے گیرج کھول لیا۔

دراصل گیرج کھولنے کا یہ ارادہ دونوں کا احمد آباد ہی میں تھا جہاں رمضان علی خاں کی شاندار گیرج صرف ہرچرن سنگھ کی دکان ہی کو نہیں کئی اور دکانوں کو بھی فیڈ (Feed) کررہی تھی۔ ہرچرن اور شکلا نے پہلے تو احمد آباد میں اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح رمضان علی خاں کو زک کر کے گیرج کا بھٹہ بٹھادیں اور تب دونوں مل کر اپنا گیرج کھول لیں۔ جب ان کی یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی تو پھر دونوں نے رمضان علی خاں سے بھرپور دوستی کرلی۔ اس دوستی نے رمضان علی خاں سے کیا قیمت وصول کی یہ تو کچھ رمضان علی کا دل ہی جانتا ہے۔ بہر حال بظاہر یہ دوستی خوب خوب پروان چڑھی۔ احمد آباد کے حالات پر ہرچرن سنگھ اور راجندر شکلا کے ساتھ رمضان علی خاں بھی بیٹھ کر خون کے آنسو بہایا کرتا تھا۔ تینوں کی آنکھوں سے رواں ہونے والے آنسوؤں کا رنگ ایک تھا لیکن غموں کی نوعیت جدا جدا تھی۔ ہرچرن سوچتا تھا کہ حالات ناگفتہ بہ ضرور ہیں لیکن ہوا کا رخ میرے خلاف نہیں۔ رمضان علی یہ دیکھتا تھا کہ طوفان کی زد میں صرف اسی کا نشیمن ہے اور طوفان کی شدت ہر روز بڑھتی جا رہی ہے اور شکلا ان کا دل رکھنے کے لئے ان دونوں کا ساتھ دیا کرتا تھا۔

ہرچرن اور شکلا کے دہلی چلے آنے کے بعد رمضان علی خود کو اور بھی تنہا محسوس کرنے لگا تھا اس لئے کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے بھی دہلی کی آمدورفت شروع کردی اور بہت جلد دونوں دوستوں کی اس رائے سے اس نے اتفاق کرلیا کہ دہلی بہر حال دارالسلطنت ہے۔ یہاں غنڈہ گردی پنپ نہیں سکتی اور کبھی سر اٹھائے گی بھی تو آہنی ہاتھوں سے کچل دی جائے گی۔

اس مشورہ کے کچھ ہی دن بعد رمضان علی خاں اینڈ سنز موٹر گیرج کا سائن بورڈ دہلی میں ''ہرچرن سنگھ شکلا موٹر گیرج کے سامنے سڑک کے اس پار آویزاں ہوگیا۔ زندگی معمول کے مطابق چلنے لگی۔ تینوں کی دوستی بھی قائم رہی۔ البتہ ہرچرن شکلا گیرج نے اپنے وجود کی برقراری کے لئے رمضان علی اینڈ سنز کو ہمیشہ ایک چیلنج سمجھا اور اسی حیثیت سے اسے قبول بھی کیا۔ یہاں تک کہ وہ دن بھی آگیا جب احمد آباد کی اس تنظیم کے کارکنوں نے اپنی لاٹھی اور ہاف پینٹ کے ساتھ ہندوستان کے مرکز کا رخ کیا اور دہلی بھی شہر اماں سے شہر خرابی میں تبدیل ہونے لگی۔ رمضان علی نے اپنی تقدیر کے ستارہ کو ایک بار پھر گردش میں دیکھا۔ تاروں کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور جہانِ دہلی دگرگوں ہوتا چلا گیا۔ پھر وہ منحوس دن

بھی آ گیا کہ جب رمضان علی نے اپنی دو جوان بیٹیوں کو ہر چرن شکلہ کے یہاں اس کے گھر کو دارالاماں سمجھ کر بھیج دیا اور خود اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیمپ میں منتقل ہو گیا۔

پورے ایک ہفتہ بعد جب حالات مکمل طور پر پرسکون ہوئے اور رمضان علی کو کیمپ سے باہر نکلنے کا موقع ملا تو بیک وقت دو دلدوز خبروں نے اس کا استقبال کیا۔ ایک یہ کہ اس کا پورا گیرج لٹ گیا اور دوسری یہ کہ اس کی دونوں بیٹیوں نے ہر چرن سنگھ کے گھر میں ہی خودکشی کر لی۔

سبب۔؟ کس کی مجال تھی کہ جا کر ہر چرن سے پوچھے۔؟ اب تو ہر چرن اور راجندر شکلا کی موٹر گیرج شاندار اور جاندار ہو چکی تھی۔ مال و اسباب کا انبار تھا۔ نئی نئی مشینوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور بورڈ کی لمبائی چوڑائی کئی گنا بڑھ گئی تھی........رمضان علی نے اچھی طرح محسوس کیا کہ ''رمضان علی اینڈ سنز'' کے بورڈ نے اپنا وجود کھو کر ہر چرن سنگھ شکلا'' کے بورڈ کو وسعت عطا کر دی ہے۔

رمضان علی اس کرفیو سے پہلے تک خدا ترسی کا زبانی دعویدار تھا لیکن اس شدید حادثہ نے اسے مکمل طور پر خدا کے حضور خود سپردگی پر مجبور کر دیا۔

رمضان علی کو یاد آیا کہ اس کے ابا جان اس سے ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ دیکھو بیٹا! خدا زمانہ کو انسانوں کے درمیان ہمیشہ پلٹتا رہتا ہے۔ اس دنیا کا عروج اور زوال ہمیشہ عارضی رہا ہے۔ اس لئے اس کی ترقی پا کر مغرور بنو اور نہ اس کے زوال سے دل برداشتگی اختیار کرو بلکہ ہر حال میں شکر و سپاس کا طریقہ اختیار کرو کہ اسی سے صبر و توکل تمہیں نصیب ہو گا اور یہی صبر و توکل سب سے بڑی دولت ہے۔

رمضان علی اس زمانہ میں جب اس کے گھر میں خوشیوں کا ڈیرہ تھا اپنے والد کی ان باتوں پر اتنی توجہ نہیں دیتا تھا البتہ یہ باتیں وہ سنتا ضرور تھا اور اتنی دیر کے لئے سنجیدہ بھی بنا رہتا تھا۔ اس کا ایک خوشگوار اثر اس کے کردار پر اس طرح نظر آتا تھا کہ وہ کبھی بد چلنی اور گمراہی کی طرف مائل نہیں ہوا۔ ہفتے میں کم از کم ایک دن وہ ضرور پورے اہتمام سے مسجد جایا کرتا تھا۔ اپنے دونوں بیٹوں کو بھی ساتھ لے جایا کرتا تھا اور دونوں بیٹیوں کو بھی اس کی تاکید کرتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آج اتنے سنگین حادثے سے دوچار ہونے کے بعد وہ صبر کا سہارا لے سکا۔ اس وقت جب کہ اس کی لاکھوں روپوں کی گیرج اس کے دوست کی دکان میں سما

جائے اور وہ چشم زدن میں مفلسی کے غار میں ڈھکیل دیا جائے۔ اپنے دوستوں پر اس نے سب سے زیادہ اعتماد کر کے اپنی دو جوان بیٹیوں کو ان کی عصمت کے تحفظ کی خاطر ان کے گھر میں پہنچا دیا تھا اور وہاں پہنچ کر اس کی دونوں بیٹیوں نے موت کو گلے لگا لیا تھا۔ یہ کیا کوئی معمولی صدمہ تھا؟ لیکن وہ صبر کر گیا۔

رمضان علی خاں چونکہ خود بھی موٹر میکنک تھا اور یہ کام کچھ کچھ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو بھی سکھا رکھا تھا اس لئے اس نے اپنی نئی زندگی نئے انداز سے شروع کر دی۔ ایک مسلم محلہ میں ایک چھوٹا سا کرائے کا مکان اس نے لے لیا اور تینوں باپ بیٹوں نے مل کر ایک گیرج میں ملازمت کر لی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اب اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے والد کی ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا بلکہ اس نے اپنے بیٹوں کو اپنے تجربات کی روشنی میں نئی زندگی اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اب وہ ہر وقت خدا اور اس کے رسول کی ہدایت کو پیش نظر رکھنے لگا اور انہی خطوط پر اپنے پورے معاشرہ کو منظم و مستحکم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورے دس برس گذر گئے۔ ان دس برسوں میں رمضان علی کو جب اپنی بیٹیوں کی یاد آتی تو وہ ہر چرن شکلا کے گھر تک چلا جاتا جہاں ان کی بیٹیاں رمضان علی سے بڑے تپاک سے ملتیں اور رمضو چچا، رمضو چچا کی رٹ لگا دیتیں۔ ہر چرن سنگھ اور راجندر شکلا بھی اگر کبھی مل جاتا تو تکلفاً کچھ دم دلاسہ کی بات کر لیتا۔ حالانکہ اب رمضان علی کو کسی دم دلاسے کی ضرورت نہیں تھی کہ ہر وقت اس کے لبوں پر ان اللہ مع الصابرین کے الفاظ رہتے۔

پورے دس برس بعد رمضان علی نے ایک بار پھر دہلی کی سڑکوں پر فوجی گاڑیوں کی بھاگ دوڑ دیکھی۔ بار بار گولیوں کی گرگراہٹ اور بموں کے دھماکوں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی اور بار بار کرفیو کا اعلان ہونے لگا۔ لیکن اس بار زمانے نے دوسری کروٹ بدلی تھی اس بار بندوق کی گولیوں کا نشانہ رمضان علی کا گھر نہیں تھا بلکہ ہر چرن سنگھ اور راجندر شکلا کے لوگ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے اور دونوں ایک دوسرے کو نشانہ بنا رہے تھے۔ رمضان علی کو اپنے والد کی نصیحت یاد آ رہی تھی۔ بیٹا خدا انسانوں کے درمیان زمانہ کو پلٹتا رہتا ہے۔ دس سال پہلے رمضان علی کی دکان اور اس کی بیٹیوں کی زندگی داؤ پر لگی تھی اور دس سال بعد ہر چرن شکلا کھلے طور پر ہر چرن بڑار اور راجندر شکلا نظر آ رہا تھا۔ کسی سنگھ نے

کسی بڑے شکلا کو گولی ماردی تھی۔ پورا شہر ایک ہفتہ سے کرفیو کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ریڈیو لگاتار ''حالات قابو میں ہیں'' کا اعلان کررہا تھا۔ پھر بھی ہر طرف سے لوٹ اور قتل کی خبریں آرہی تھیں۔ مگر ایسے وقت میں بھی ہرچرن شکلا اینڈ کمپنی کے مالکان ہرچرن سنگھ اور راجندر شکلا ایک، دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے۔ ایک ہی بڑے مکان میں اپنے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رہ رہے تھے۔ دونوں کی ایک ایک بیٹی تھی۔ دونوں جوان ہوچکی تھیں۔ دونوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر اب ان کے والدین کو دامن گیر تھی۔ ہرچرن سنگھ اور شکلا دونوں بیٹھ کر بڑے بڑے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ کرفیو جاری تھا اور آج کرفیو کا ساتواں دن تھا۔ ہرچرن اور شکلا حسبِ معمول اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے شغل ناؤ نوش میں لگے تھے اور دونوں میں گرما گرم بحث ہورہی تھی۔

یہ بحث ان کا روز کا معمول تھا۔ کبھی کبھار جب بحث میں گرما گرمی بڑھ جاتی تھی تو دونوں کی بیویاں اور بیٹیاں آکر بیچ بچاؤ کرادیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ بیچ بچاؤ بھی کبھی کبھی عجیب تیور رکھتا تھا۔ جب یہ دونوں کچھ زیادہ چڑھالیا کرتے تھے تو پھر اپنی بیویوں کو دیکھ کر ان کا نشہ ور چڑھ جاتا تھا اور وہ دونوں اپنا اپنا نشہ اپنی اپنی بیویوں پر اتارا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بیٹیاں ایسے ہنگامہ کے موقع پر جانا ترک کرچکی تھیں اور بیویاں بھی فطری شرم و حیا کے سبب کترانے لگی تھیں۔

آج بھی دونوں بحث کررہے تھے۔ ملی جلی آوازیں کچھ اس طرح کی تھیں۔ ''سارا قصور تمہارے فرقہ والوں کا ہے۔ نہیں تمہارے فرقہ والوں کا ہے۔ نہیں تمہارے۔ نہیں تمہارے نہیں تمہارے کی صدا بتدریج بلند ہوتی جارہی تھی۔ پورے گھر کے لوگ ان کی یہ رٹ سن رہے تھے کہ اچانک ایک زوردار چیخ ابھری۔ یہ چیخ بھیانک بھی تھی اور مختلف بھی۔ چیخ سن کر تمام عورتیں بیک وقت ڈرائنگ روم تک پہونچیں تو ایک دلدوز منظر سامنے تھا۔ دونوں کا ہاتھ ایک دوسرے کے گلے پر تھا اور دونوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ گرد وپیش میں کئی بوتلیں گری پڑی تھیں۔ یہ منظر عورتوں کے لئے حوصلہ شکن تھا۔ چنانچہ سب کی سب چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ یہ سوچے بغیر کہ کرفیو نافذ ہے اور سڑک پر پولس گشت کررہی ہے۔ آہستہ آہستہ پولس کا ہجوم بڑھنے لگا۔ مختلف گاڑیاں دروازہ پر جمع ہونے لگیں۔

لاش اٹھائی گئی۔ کمرہ اور اس کے گرد و پیش کی تصویریں لی گئیں اور گھر کے سارے لوگوں کو لاشوں کے ساتھ پولیس والے پولیس اسٹیشن لے آئے۔ گھر میں تالا لگ گیا۔ پولیس اسٹیشن تک آنے والوں میں ہرچرن سنگھ اور راجندر شکلا کی بیویاں، دو جوان بیٹیاں اور دو کم عمر بیٹے شامل تھے۔ رات بارہ بجے پولیس کی جیپ نے دونوں بیویوں اور کم عمر لڑکوں کو ان کے گھر پہنچا دیا اور لڑکیوں کو روک لیا کہ ان سے تفصیلی بیان لینا باقی تھا۔

رات کے بارہ بجے سے صبح چار بجے تک تقریباً ایک درجن لوگوں نے ان دونوں جوان لڑکیوں سے جو بیان لیا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ صبح کے چار بجے دونوں کو چھوڑ دیا گیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اب وہ سیدھی اپنے گھر چلی جائیں اگر کوئی دوسری بات کسی سے کہی گئی تو پھر آج ایک درجن مردوں نے ''بیان'' لیا ہے کل ان کی تعداد کئی درجن ہو سکتی ہے۔

پولیس اسٹیشن سے باہر نکل کر دونوں لڑکیاں اپنا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور انہیں وہ چیخ یاد آئی جو آج سے دس برس پہلے انہوں نے اپنے گھر میں رمضو چچا کی بیٹیوں کی سنی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے جب ان کے درندہ صفت باپوں نے ان عفت مآب بیٹیوں کو آرام کرنے کے لئے چھوڑا تھا تو ان دونوں نے دنیا میں مزید کچھ لمحہ جینے کی مہلت چاہنے کی بجائے مستقل آرام گاہ کی جانب رخصت ہو جانا پسند کر لیا تھا۔

ان مرحوم بچیوں کی چیخیں آج ان دونوں لڑکیوں کے کانوں کے پردوں کو پھاڑ رہی تھیں اور دونوں پولیس اسٹیشن سے باہر سر پکڑ کر بیٹھی ہوئیں اپنے ریزہ ریزہ وجود کو دیکھ رہی تھیں کہ اچانک ایک پولیس والا چیخا۔ ''بھاگتی ہے یا نہیں''۔ یہ ڈانٹ سن کر رات کی خوفناکی کا تصور ان کے دماغ میں پھر ابھر آیا اور دونوں نے اکھڑے اکھڑے قدموں سے گھر کی راہ لی لیکن چوراہے پر پہونچ کر انہیں یاد آیا کہ اس سڑک پر جہاں ان کا گھر ہے کرفیو نافذ ہے۔ پولیس کی گاڑیاں وہاں اب بھی دندنا رہی ہوں گی۔ دوسرے ہی لمحہ دونوں کے قدم اس جانب اٹھ گئے جہاں رمضو چچا کا گھر تھا۔

صبح کی اذان ہو چکی تھی۔ سفیدی آہستہ آہستہ سیاہی کو شکست دے کر اپنا تسلط فضاؤں پر قائم کر رہی تھی کہ رمضان علی کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہوئی۔ رمضان علی اب اپنے بیٹوں کے ساتھ مسجد جانے ہی والے تھے کہ اس دستک نے ان کو متوجہ کیا۔ رمضان

علی نے آ کر دروازہ کھولا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہر چرن سنگھ اور راجندر شکلا کی جوان بیٹیاں بہار کی نورس کلیاں اچانک خزاں رسیدگی کے عالم میں گل پژمردہ کی طرح دامن صد چاک لئے مبہوت کھڑی ہیں۔ رمضان علی نے کہا۔ آؤ بیٹیو! اندر آ جاؤ۔!

بیٹیو کا لفظ سننا تھا کہ ان دونوں لڑکیوں کا کلیجہ پھٹ گیا۔ دونوں رمضان علی کے کلیجہ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں اور کہنے لگیں ''رمضو چچا آپ کی بیٹیاں غیرت والی تھیں کہ ہمارے درندہ صفت باپوں کی بے غیرتی کو چھپا کر دنیا سے چلی گئیں اور ہم لوگ اس غیرت سے محروم ہیں کہ ظالموں کی درندگی کا شکار ہونے کے بعد بھی آپ کے سامنے کھڑی ہیں۔ رمضو چچا ہمارے باپوں نے جو حرکت آپ کی بچیوں کے ساتھ کی وہی حرکت آج ہمارے ساتھ ہمارے منحوس باپوں کی لاشوں کے سامنے پولیس والوں نے کی''۔

''رمضو چچا! اب ہم بھی اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتیں۔ صرف اطلاع دینے آپ کے پاس آئی تھیں''۔ اور یہ کہہ کر دونوں دروازہ کی طرف واپس ہونے لگیں۔

رمضان علی کی بیوی اور ان کے بیٹے یہ واقعات سن کر لرز اٹھے اور ان کی آنکھیں جھم جھم برسنے لگیں۔ رمضان علی نے بڑے عزم اور پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''بیٹیو! دروازہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے۔ اب ہماری بیٹیاں دوسری بار ہم سے کیسے جدا ہو سکتی ہیں؟ تم یہ سمجھو کہ اب میری عصمت اور عفت جہاں تم ہی ہو اور وہ لڑکیاں جو خودکشی کر گئیں وہ ہر چرن سنگھ کی آشا اور راجندر کی ابھیلاشا تھی۔

بیٹی تمہارے دادا مجھ سے کہا کرتے تھے کہ خدا انسان کے درمیان زمانہ کو پلٹتا رہتا ہے۔ بیٹی میں بھی تم سے یہی کہتا ہوں۔ اتنا کہہ کر رمضان علی نے ایک بار پھر ان دونوں لڑکیوں کو گلے سے لگا لیا۔ اور تب وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ صبح کی نماز کا وقت تو ختم ہو گیا تھا لیکن رمضان علی کو لگا کہ نئی صبح کا نیا سورج طلوع ہو چکا ہے اور شاید اس روشنی میں سارے لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔ خدا اسے انسانوں کے درمیان ادل بدل کرتا رہتا ہے۔!!

پٹنہ ریڈیو سے نشر
مطبوعہ ''روحِ ادب'' کلکتہ اور
سالنامہ ''سیارہ'' لاہور ۹۲ء

☆☆

عینک

پچھلے پندرہ دنوں سے وہ اپنے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کے وی۔آئی۔پی وارڈ میں اپنے شب و روز گذار رہا تھا۔ڈاکٹروں کے مطابق وہ کسی مہلک مرض کا شکار نہیں تھا پھر بھی ہر وقت اس کی دیکھ ریکھ لازمی تھی۔اسے صرف آرام کی ضرورت تھی۔اُسے صرف آرام کرنا تھا، کم بولنا تھا، کم لوگوں سے ملنا تھا، کسی مسئلہ پر اسے کم سے کم سوچنا تھا۔باقی سارا کام تو اس کے لئے آسان تھا لیکن یہ آخری شرط بہت کڑی تھی۔وہ کبھی کبھی یہی سوچنے لگتا کہ آخر اسے کچھ کیوں نہیں سوچنا ہے؟ یہ سوچ اس کے لئے اتنی آزمائش کی سوچ بن جاتی کہ دوسرے دن جب وہ سورج طلوع ہونے کے ساتھ بستر سے الگ ہونا چاہتا تھا تو اس کا وجود اس دن زیادہ بھاری معلوم ہونے لگتا اور طبیعت زیادہ نڈھال ہونے لگتی۔آخر اس نے اپنے لئے ایک نسخہ تجویز کیا۔اس نے یہ طئے کیا کہ اس کی فکر کی ترجیحات ہونی چاہئیں۔اسے کچھ موضوعات پر غور کرنا چاہئے اور کچھ سے پہلو تہی کرنی چاہئے۔اس طرح اس نے ایک شب اپنے ذہن میں ایک فہرست مرتب کرلی۔یہاں تک کہ ایک شب اس کا ماضی اس کا موضوع فکر بن گیا۔

اور تب اس کے سامنے ماضی کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے۔پورے پندرہ سال پیچھے وہ چلا گیا۔جب ہندوستان کی ایک اچھی یونیورسٹی سے اس نے اعلیٰ تعلیم کی ایک اچھی سند حاصل کرلی تھی۔علم سیاسیات اس کا موضوع تھا۔دوران مطالعہ اس نے معاشیات، عمرانیات اور تاریخ کا مطالعہ کرلیا تھا۔وہ اپنے ہم عصروں میں اپنی علمی صلاحیت کے نقطۂ نظر سے کافی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔لوگ اس سے نہ صرف ان موضوعات پر کچھ باتیں کرتے بلکہ اکثر اس گفتگو کے دوران میں جب اس کی زبان سے ادب کے عروق

شیریں کا چشمہ پھوٹتا تھا تو لوگ حیرت سے اس کا منہ تکا کرتے تھے اور دل ہی دل میں اس کی علمی صلاحیت پر عش عش کرتے تھے۔

لیکن۔! اس کی یہ ساری صلاحیتیں اس وقت اس کا منہ چڑاتی ہوئی نظر آتی جب وہ اعلیٰ تو کجا اک ادنیٰ ملازمت کے حصول میں بھی ناکام ہو جاتا۔

مختلف دفاتر کے چکر کاٹتے کاٹتے اس کے پاؤں شل ہو چکے تھے۔ اس نے بطور خود نہ جانے کتنے افسروں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ کتنے سیاست دانوں کی کاسہ لیسی کی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ملازمت نام کی چڑیا نہیں آسکی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی ملازمت کی عمر گذر گئی اور وہ اپنے حال کی راہوں کو مستقبل کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی مسدود ہوتی ہوئی محسوس کرنے لگا تھا۔

اور تب۔! اسے خیال آیا کہ اب ایک ہی راہ بچی ہے کہ جس پر چل کر مستقبل کو کسی قدر گوارہ بنایا جاسکتا ہے اس کے اندر کے آدمی نے اسے اکسایا کہ کچھ کر گذرنے سے تمہیں کون روکتا ہے۔؟ تمہارے پاس رشوت دے کر ملازمت حاصل کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے تو کیا ہوا۔ اتنا پیسہ تو تمہارے پاس ضرور ہے کہ جس سے تم کوئی چھوٹا سا کاروبار ضرور شروع کر سکتے ہو۔؟

اندرون کی یہ آواز سن کر اس نے ایک انگڑائی لی۔ کاربار نہیں کاروبار ہاں کاروبار۔ ہر وقت اس کی نگاہ کے سامنے یہی سوال مچلنے لگا۔ وہ کون سا کاروبار کرے؟ کتنے پیسے وہ اس میں لگا سکتا ہے؟ اس کے خطرات کیا کیا ہیں؟۔

خسارہ کا خطرہ۔؟

احباب کی نگاہ کرم کا خطرہ۔؟

کساد بازاری کا خطرہ۔؟

بازار کی رنگ داری ٹیکس کا خطرہ۔؟

اور ان سب سے بڑھ کر فسادات کے عفریت کا خطرہ۔؟

خطرہ۔ خطرہ۔ خطرہ۔

ایک بار پھر اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ ان خطرات کو نظر کے سامنے دیکھ کر۔ لیکن اس کے اندرون سے پھر آواز آئی کہ خطرات مول لئے بغیر زندگی مسرت بہ کنار نہیں ہو سکتی۔

اور تب۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی کاروبار ضرور شروع کرے گا

اگلا مرحلہ اس کے سامنے پھر اس کا آیا تھا کہ آخرش وہ کون سا کاروبار شروع کرے؟ اس کے لئے اس نے سڑکوں اور بازاروں کے چکر کاٹے۔ مختلف کاروباری اداروں کا اس نے جائزہ لیا۔ ایسی جگہ بھی دیکھی جہاں لاکھوں کا سرمایہ لگا ہے اور لاکھوں کا منافع ہو رہا ہے اور اس نے ایسے ادارے بھی دیکھے جہاں سرمایہ کم اور عقل زیادہ کماتی ہوئی نظر آئی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے یہ طئے کر لیا کہ وہ ایک عینک سازی کی دکان کھول لے گا۔ عینک؟ ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ واہ۔ واہ کیا خوب خیال ہے۔

یہی تو وہ کاروبار ہے جس میں ان گاہکوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ جن کی آنکھیں چیزوں کی اصل حقیقت کو خود نہیں دیکھ سکتیں۔ کبھی انہیں ایک کا دو ہی نہیں چار چار اور آٹھ آٹھ بھی نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی سامنے کی حقیقت بھی ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اور کبھی پوری کائنات صاف و شفاف ہونے کے باوجود دھندلی نظر آتی ہے۔ پھر عینک اپنے کرشمے دکھاتا ہے۔ وہ کبھی ان گنت کو ایک میں تبدیل کر دیتا ہے۔ کبھی دودھیا کو سبز بنا دیتا ہے۔ کبھی سبز کو سرخ اور سرخ کو سیاہ۔ کبھی اس کی نظر کے سامنے ترنگا پھہرانے لگتا ہے کبھی دورنگا۔ کبھی سرخ کبھی نارنجی اور کبھی سبز۔

اور تب۔! اس کی ذہانت نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ایک صبح شہر کے لوگوں نے دیکھا شہر کے ایک نسبتاً کم آباد علاقہ کے موڑ پر ایک بڑا سا سائن بورڈ آویزاں تھا ''آپٹیشین'' (Optician) نیچے مقامی زبانوں میں لکھا تھا ''چشمہ ہی چشمہ''۔ سڑک سے گذرنے والے لوگ اس خوبصورت سائن بورڈ کو دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔ دھیرے دھیرے کچھ منچلے نوجوانوں کو ایک دلچسپی کا سامان نظر آیا۔ کسی نے آکر پوچھا تھا۔ ''آپ آپٹیشین ہیں''؟ اس نے برجستہ کہا تھا ''تو کیا میں آپ کو میجیشین (Magician) نظر آ رہا ہوں''۔؟ لڑکے قہقہہ

لگا کر آگے بڑھ گئے۔ لیکن اس نے ان کے دلوں میں اترنا شروع کر دیا اور وہ سب یہ سوچنے لگے کہ دکاندار حاضر جواب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ دھیرے دھیرے وہ لوگ اس دکان پر آ کر بیٹھنے لگے اور تب۔ دکان کی بھیڑ بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک دن تقدیر کا مارا وہ شخص آیا جس کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا۔ اس نے آ کر کہا۔ جناب اب سے کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے میری نگاہ ٹھیک کام کرتی تھی۔ مجھ کو ہر چیز سہ رنگا نظر آتی تھی اور میں نہ صرف یہ کہ خود اس کا دلدادہ تھا بلکہ ایک پورے زمانہ کو میں نے اس کا فدائی بنا رکھا تھا اور وہ سب لوگ میرے اشاروں پر ناچتے تھے۔ میرا حال تو یہ تھا کہ میں اپنی بیوی کو ساڑی بھی جب کبھی خرید کر دیتا تو اس کا رنگ بھی تین ہوا کرتا تھا اور اس طرح میرے دل و دماغ میں ایک مخلوط تہذیب رچ بس گئی تھی اور میں نیرنگی میں یک رنگی کا قائل تھا۔

لیکن یکا یک اس سہ رنگا ساڑی والی دکان پر نئے نئے گاہک جمع ہو گئے اور میں پرانا آدمی آوٹ آف ڈیٹ قرار دے دیا گیا ہوں۔ اب حال یہ ہے کہ کوئی رنگ میری نظر میں نہیں جچتا ہے اور اگر میں کسی ایک رنگ سے دل لگا کر بیٹھ جاؤں تو ان سارے لوگوں کا کیا ہوگا جو کل تک میرے ساتھ تھے اور میری ہی طرح ایک سے زیادہ رنگوں پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے۔؟

اور تب۔! میں نے کہا تھا کہ جناب میری عینک کا کمال یہ ہے کہ میں جیسا رنگ چاہوں گا دنیا آپ کو ویسی نظر آئے گی۔ پھر تھوڑی محنت کرنی ہوگی۔ مجھ سے آپ کچھ اور عینک خرید لیں گے اور اپنے خاص خاص لوگوں کو انہیں آپ تحفتاً دے دیں گے۔ جس سے سارے لوگ آپ ہی کے رنگ کے دلدادہ ہو جائیں گے۔

جب اس قسمت کے مارے خوش نصیب نے میری عینک استعمال کی تو اسے ساری دنیا پیلی نظر آنے لگی۔ پھر اس نے مجھ سے کچھ اور عینک خرید لی اور اسے تقسیم کر دیا۔

ایک دن اس شخص نے مجھ سے آ کر کہا۔ ''وہ لوگ کہتے ہیں پیلا رنگ لاغری کی علامت ہے''۔

میں نے جواب دیا۔ آپ زردی میں کچھ سرخی ملا دیجئے رنگ بدل جائے گا۔ یہ

نسخہ اسے جیسے ہی ہاتھ لگا خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔اس نے اگلے ہی دن سے سرخی کی ارزانی کا کاروبار شروع کردیا۔ ہر چہار طرف معصوموں کی شہ رگ کاٹ کاٹ کر اس شخص نے اپنے چند کارکنوں کے ساتھ خون کی سرخی اپنے لیبل کی زردی میں شامل کرنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ پورا علاقہ اسے نارنجی نظر آنے لگا۔ پھر کیا تھا

''آپٹیشین'' ایسے تمام مایوسوں کے لئے درحاجت روا بن گیا۔ یہاں ہر نا امید کی امید برآنے لگی۔ کسی کو سبز اور کسی کو سرخ عینک یہاں سے ملنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے پندرہ سال میں میں پورے ملک کی تقدیر کا کاتب بن گیا۔اب اگر میں زندگی کے بقیہ ایام اسی وی۔آئی۔پی وارڈ میں بھی گذار دوں تو میرے لئے اس میں کوئی الجھن اور تشویش کی بات نہیں۔اب میری نسلوں کو ملازمت کے لئے در بدر نہیں بھٹکنا پڑے گا۔اب تاریخی عینک کا کاروبار عروج پر ہے۔اب کینل کے زرد رنگ میں معصوموں کے خون کی سرخی تیزی سے ملائی جارہی ہے اور میری عینک سینکڑوں، ہزاروں نہیں۔لاکھوں کی تعداد میں بک رہی ہے۔ہا۔ہا۔ہا۔

وہ اپنے وارڈ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور خوشی سے ناچنے لگا۔واہ ری میری تجارت۔واہ۔واہ۔واہ۔!!!

پٹنہ ریڈیو سے نشر
مطبوعہ ''انشاء'' کلکتہ

☆☆

بابر بہ عیش کوش

لکھمدیاں والوں کے دماغ میں نہ جانے کہاں سے یہ بات جم گئی تھی کہ وہ لوگ ایک ایسی آبادی کے رہنے والے ہیں جس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاندار بھی ہے۔قدامت کا احساس اور شاندار ہونے کا زعم سروں پر کچھ ایسا سوار تھا کہ یہ نشہ کسی بھی طرح اترتا نظر نہیں آتا۔اس کے امیر مال اور غریب حال دونوں مست تھے۔البتہ بندۂ بیچارہ کوچہ گرد ہوتا چلا جارہا تھا لیکن اس کی کوچہ گردی کا کسی کو صحیح احساس نہیں تھا۔

یہ بات تو سچ ہے کہ اب سے سو پچاس سال پہلے علاقہ کی تمام آبادیاں لکھمدیاں والوں کو اپنا قائد وامام تصور کرتی تھیں لیکن وہ زمانہ وہ تھا کہ جب علوم سے لوگوں کو شغف تھا۔زہد واتقاء قابلِ فخر باتیں تھیں۔خدمت گذاری، حلم وبردباری ان کا شیوہ تھا اور۔اب یہ ساری باتیں کل کی ہے۔

حال اور ماضی میں اگر تضاد نہ ہوتا تب بھی شاید کچھ بات بن جاتی لیکن حال کا یہ حال ہے کہ ہر کوئی مست مئے پندار ہے۔

ایک دن اچانک ایک بزرگ نما شخص کو یہ خیال آیا کہ سڑک پر پھیلے بھگوانوں کی جھرمٹ میں اگر نعرۂ تکبیر بلند نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اسلام خطرہ سے دوچار ہو جائے گا بلکہ سرزمین ہند سے ان کا ملیا میٹ بھی ہوسکتا ہے۔اور تب یہ فکر سمائی کہ سڑک کے کنارے بھی ہماری شان کا مظاہرہ ہونا چاہئے۔اس لئے کہ ان کے یہاں کے لوگ شاندار روایت کے حامل رہے ہیں۔وہ بزرگ اسی فکر میں سڑکوں کی خاک چھان رہے تھے کہ یکا یک ایک دن سڑک کے کنارے انہیں ایک جگہ نظر آگئی۔انہوں نے اولین فرصت میں اس جگہ کو صاف ستھرا کرایا۔

ان کی اس نئی کوشش نے دیکھنے والے کم علم لوگوں کے ذہن میں ایک نیا نشان سوال پیدا کیا۔ حضرت بزرگ کی بزرگی کئی کاندھوں پر سوار ہو کر پہلے ہی کئی گاؤں تک پہنچ چکی تھی۔ ان کے اس طرزِ عمل نے ذہنوں میں یہ تصور بٹھانا شروع کر دیا کہ یقیناً یہ کسی بہت بڑے بزرگ کی آرام گاہ ہے ورنہ حضرت خود جاروب کش نہ ہوتے۔ بس کیا تھا زبانِ خلق نقارۂ خدا۔ ہر طرف بات پھیل گئی اور پھیلتی چلی گئی۔

جاروب کشی کا سلسلہ ابھی چند دن چلا ہی تھا کہ ایک دن ایک بدمست ڈرائیور کا ہاتھ ٹھیک اسی جگہ لڑکھڑا گیا۔ ٹرک سڑک کے کنارے اتر گئی لیکن ڈرائیور کو خراش تک نہ آئی اور نہ مال واسباب ہی ضائع ہوا۔ اس جگہ موجود معتقدین کے ذریعہ ٹرک سیدھی کی گئی اور کرامتوں کے کئی قصے ڈرائیور کے کانوں میں پھونک دیئے گئے۔ اس ٹرک پر اسمگلنگ کا سامان لدا تھا۔ چند ہی دنوں میں یہ سامان جہاں جہاں پہنچا تذکرۂ کرامات بھی وہاں وہاں پہنچ گیا۔ دلی، بمبئی، مدراس اور کلکتہ چاروں طرف یہ بات پھیل گئی۔ اب جتنی بھی گاڑیاں اس طرف سے گذرتیں ان کی رفتار اس جگہ پہنچ کر دھیمی ہو جاتی اور ڈرائیور کا سر لمحہ بھر کے لئے جھک جاتا۔ پہلے واقعہ کے پندرہ دن بعد ہی ٹھیک اسی جگہ ایک بڑے سیٹھ کی کار کے ایک چکہ کی ہوا نکل گئی اور تب دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دوسرے واقعہ کے چند دن بعد ہی وہ سیٹھ جس نے لاکھوں لاکھ روپیہ صرف سود کمایا تھا حضرت جاروب کش کے آگے دست بستہ کھڑا ہے۔ ''حضور! کچھ خدمت کا موقع دیا جائے۔''

''اجی صاحب! اپنے کام سے کام رکھو۔ فقیروں کی خدمت کیا کرو گے؟''

''حضور کم از کم اتنا تو حکم دیا جائے کہ ایک پختہ دالان تعمیر کرادوں''

''نہیں صاحب! اس دالان والان کی یہاں کیا حاجت۔؟ جاؤ اپنا کام کرو۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔''!

خدا تمہیں خوش رکھے۔ کا آشیرواد لے کر جب سیٹھ وہاں سے رخصت ہوا تو ٹھیک اسی دن اس سیٹھ کو ایک بڑی لاٹری پھنس گئی۔ بس کیا تھا۔ سیٹھ اس بار آ کر حضور کے پاؤں پر گر پڑا۔

''سرکار خدمت کا موقع دیا جائے۔''

پریس والوں نے اسی وقت اس خاص لمحہ کو کیمرہ میں بند کیا۔ دوسرے ہی دن سارے ہندوستان میں ان کا شہرہ ہوگیا۔ اخبار کی شاہ سرخی کچھ اس طرح تھی۔

''سیٹھ کرامات کا قائل ہوگیا۔''

ذیل میں جو مضمون درج تھا وہ کچھ یوں تھا۔ کار کی ہوا نکل گئی۔ اور کار بچ گئی۔ سیٹھ نے ہاتھ جوڑا اور پانچ لاکھ کی لاٹری مل گئی......... سیٹھ نے خدمت کی اجازت مانگی..............

اور تب دوسرے ہی دن سے اس جگہ ایک خوبصورت عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی جس پر لکھا تھا۔ دو سو سال پہلے روپوش ہو جانے والے بزرگ حضرت.. بابا... شاہ دنیا سمیٹنے اور سیٹھ بننے کی تمنا رکھنے والوں کا اژدہام دوسرے ہی دن سے حضرت کے گرد و پیش ہونے لگا۔ حضرت خدمت سے انکار کرتے رہے اور سڑک کے کنارے شاندار محل تعمیر ہوتا چلا گیا۔ زمین کی کوئی پرواہ نہ تھی کہ ایک سیکولر ملک کی سڑک کی ساری زمینوں پر عبادت گاہ تعمیر کرانے کا پیدائشی حق ہر شہری کو حاصل ہے۔ مسجد نہ سہی۔ مندر اور مزارات تو بن ہی سکتے ہیں۔ محل تعمیر ہوگیا۔ قمقمے لگ گئے۔ جھلملی ٹنگ گئی۔ سڑک چھاپ بھگوانوں کے درمیان تکبیر کا نعرہ بلند ہوگیا۔ علاقہ کے لوگ لکھمیاں کی عظمت کے قائل ہونے لگے۔ گذرنے والی گاڑیوں سے سکوں کی بارش ہونے لگی۔ پورے دس سال بعد جب اس قصہ کا راوی دوسری بار اس جگہ سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ وہاں ایک کی جگہ دو بزرگ آرام فرما ہیں۔

معلوم ہوا کہ دوسرے بزرگ وہی حضرت جاروب کش ہیں جن کی برکت نے سیٹھ کو لاکھ پتی بنا دیا تھا اور جنہوں نے خداوند جل جلالہٗ کے حضور حاضر ہونے سے پہلے ہی اپنے چاروں بیٹوں کو ایک ایک پکا مکان اور کئی کئی بیگھہ کاشت کی زمین عنایت کر دی تھی جبکہ خود ان کے ابا حضور انہیں صرف ایک کٹھہ سے نوازا تھا!

اب یہ چاروں صاحبزادے اس مقام مقدس کے چاروں طرف ستون کی حیثیت رکھتے ہیں جس پر شب و روز سکون کی بارش ہو رہی ہے۔

اور۔ بیچارہ راوی اب بھی سڑکوں کی خاک چھان رہا ہے۔ سب سے کہتا پھر رہا ہے کہ۔ زندگی پاکبازی کے ساتھ گذارو۔ خبردار کسی کو دھوکا نہ دو۔ عیاری کی کمائی کو مال حرام سمجھو۔ اللہ کی آیات کو چند سکّوں کے عوض فروخت نہ کرو۔ یاد رکھو ایک دن تمہیں خدائے علیم وخبیر۔ منصف وعادل کے پاس حاضر ہونا ہے۔ یاد رکھو کہ روز حساب سخت ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ اس دن تمہیں رسوا ہونا پڑے۔!!!

راوی کی یہ بات لوگ سن رہے ہیں۔ سر دھن رہے ہیں۔ مگر اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ انہیں اگر کوئی سبق یاد ہے تو وہ صرف یہ ہے۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دو بارا نیست۔

پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆

فوزِ عظیم

عدالت میں آج جس مقدمہ کا فیصلہ ہونے والا تھا اس کی نوعیت کچھ عجیب سی تھی۔ ملزم صرف ایک تھا لیکن فیصلہ سننے والوں کی زبردست بھیڑ تھی۔ نہ صرف عدالت کا کمرہ بلکہ پورا لان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔

ملزم کے ساتھ نہ کوئی وکیل تھا نہ کوئی پیروی کار۔ کہا جاتا ہے کہ ملزم کو اپنے معاملہ میں مکمل اطمینان تھا اور وہ خود کو ہر فیصلہ کے لئے تیار کئے بیٹھا تھا۔ بہت سارے لوگوں نے ملزم کو یہ پیش کش کی تھی کہ اس کی جانب سے کوئی وکیل رکھا جائے اور اس وکیل کے سارے اخراجات پیش کش کرنے والے لوگ خود ہی برداشت کریں گے۔

لیکن! ملزم نے اس پیش کش کو خوبصورتی سے ٹال دیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مقدمہ کے شروع ہونے کے بعد اسے فیصلہ کی منزل تک پہنچنے میں بہت کم وقت لگا تھا۔ اتنی کم مدت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ ہو جانا ایک حیرت انگیز بات تھی اور اس عدالت کا ہی نہیں سارے ملک کی عدالت کا یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔

جیسے جیسے فیصلہ کی گھڑی نزدیک آ رہی تھی لوگوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ عدالت نے لوگوں کی آمد پر کوئی روک نہیں لگائی۔ وہ بھی یہ چاہتی تھی کہ اس ملزم کا فیصلہ عوام کے سامنے کھلی عدالت میں ہو تا کہ آنے والے وقتوں میں کسی دوسرے شخص کو ایسے جرائم میں ملوث ہونے کی ہمت نہ ہو۔ عدالت کی نظر میں عبرت کے لئے یہ کام ضروری تھا۔

لیکن عوام کی نظر میں اس کی نوعیت جداگانہ تھی۔ عوام جو بے زبان تھے اپنے ہر دلعزیز ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے تھے۔ آنے والے تمام لوگوں کے دل میں یہ تمنا کسمسا رہی تھی کہ کاش آخری آخری وقت میں بھی اس خوش نصیب شخص کو جس کے چاہنے

والوں کا کوئی شمار نہیں سزا پانے سے بچالیا جاتا۔ اس ایک شخص کے بدلہ میں عدالت جتنے اشخاص کی قربانی طلب کرتی قطار اندر قطار لوگوں کو اس کے لئے آمادہ پاتی۔

وقت کا سفر جاری تھا۔ گھڑی کی سوئیاں سرعت سے کھسک رہی تھیں اور اس منصف کے لئے جگہ بنا رہی تھیں جسے آج کے دن کا ایک تاریخی فیصلہ سنانا تھا۔

عوام کو یہ یقین تھا کہ منصف بہر حال انسان ہے۔ اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل ہے۔ وہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی انصاف کی طرف مائل ہوگا اور اس کا ضمیر آخری لمحہ میں بھی اگر اسے پکار کر کہے گا کہ تم جس کرسی پر بیٹھے ہو اس کی عصمت دری مت کرو۔ یہ کرسی انصاف کی کرسی ہے۔ یہاں سے اگر تم نے کسی بے گناہ کو سزا دی تو یہ اس کرسی کی توہین ہوگی۔

سارے لوگ اسی فکر میں غلطاں تھے کہ جناب منصف کرسئ انصاف پر آکر بیٹھ گئے اور مقدمہ کا آخری باب کھل گیا۔

مجرم! تم جانتے ہو کہ مقدمہ کا آج آخری دن ہے۔؟

آج بھی اگر تم چاہو تو اپنی صفائی میں کوئی بات کہو یا پھر اپنی جانب سے کوئی وکیل لے آؤ۔!

حضور والا۔! ملزم نے نہایت پرسکون اور پروقار انداز میں کہا۔ میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ آخر میرا جرم کیا ہے؟

مجرم! تم ایک مشہور قلم کار ہو۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے مقدمہ کی سماعت کے دوران میں میں نے تمہاری تمام تحریروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے حضور والا۔! آپ نے میری ساری تحریریں پڑھ لیں۔ لیکن یہ ساری چیزیں آپ تک کیسے پہنچیں۔؟ میں تو پچھلے بیس بائیس برسوں سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں۔ سارے ملک کے جرائد و رسائل میں میری تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے بہت سی چیزیں تو خود میرے پاس بھی نہیں ہیں۔

ملزم! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ تمہارے اس مقدمہ میں مدعیوں کی تعداد جتنی ہے اس سے کہیں زیادہ لوگ تمہارے مدعیوں کی حمایت میں ہیں۔ اس سے عدالت اس نتیجہ پر

پہنچی ہے کہ تم نے عوام کی ایک بڑی تعداد کا دل دکھایا ہے۔

حضور والا! میں یہ عرض کروں گا کہ لفظ ''دل دکھایا ہے'' واپس لے لیا جائے۔ میری حیات کا مقصد تو لوگوں کو سکھ پہنچانا ہے۔

یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔! اگر تم لوگوں کو سکھ پہنچانا چاہتے تو ساری دنیا جس ڈھنگ پر چل رہی ہے اسے اسی روش پر چلنے دیتے ان کی راہوں کا تم روڑہ نہیں بنتے اور ان مدعی حضرات کو کبھی دکھ نہیں پہنچتا۔ بلکہ یہ لوگ تمہیں بڑے بڑے جلسوں میں بلاتے۔ بڑے بڑے انعامات دلاتے اور تمہارا بیحد احترام کرتے۔

تم اگر کہانیاں لکھتے تو ان کا موضوع عشق ومحبت کی فرضی داستان ہوتا جن سے لوگوں کا نفس مطمئن ہوتا۔ تم اگر اشعار کہتے تو ان میں الفاظ کی چمک دمک سے لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ بنائے رکھتے تم اگر مضامین لکھتے تو ہزار تلاش کے بعد بھی ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر تم یہ چیزیں..........

معاف کیجئے گا حضور والا۔! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مدعی کون کون لوگ ہیں۔؟

یہ تمہیں معلوم ہے۔ اسے دوہرانے سے نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کا موقع ہے۔!

بیشک مجھ کو معلوم ہے۔! یہ بات تو مجھ کو اس وقت سے معلوم ہے۔ جس وقت میں نے قلم ہاتھ میں پکڑا تھا۔ میں جس وقت ان لوگوں کی کہانیاں لکھتا تھا اس وقت ان کا مکروہ چہرہ میری نظر کے سامنے تھا اور آج بھی ہے۔ البتہ ان کہانیوں میں میں نے ان چہروں کو پیش کر کے جن لوگوں کو دکھانا چاہا تھا آج آپ کی عدالت میں یہاں سے وہاں تک وہ لوگ جمع ہیں۔ آپ برائے کرام ان کے نام گنوادیں۔ تا کہ یہ لوگ انہیں ایک بار پھر دیکھ لیں اور اچھی طرح پہچان لیں۔!

مجرم۔! تم اب بھی ان معزز ہستیوں کی توہین سے باز نہیں آئے ہو؟ یہ عدالت چاہتی ہے کہ ان کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے۔!

حضور والا۔! ہستی کا معزز ہونا اور پھر ان کی توہین یہ سب آپ کی اپنی لغات کے خوبصورت الفاظ ہیں۔ معزز تو وہ لوگ ہیں جن کا اس دنیا میں ہر لمحہ استحصال کیا جا رہا ہے اور

وہ خاموشی سے سب کچھ جھیل رہے ہیں۔ توہین تو ان کی ہو رہی ہے جو خدا کی دھرتی پر انسان کی حیثیت سے بھیجے گئے اور آپ کے ان معززین نے انہیں جانور سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ انہیں نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ اور طبقہ کے خانوں میں بانٹ بانٹ کر ان کا ساری صلاحیتوں کو دریا برد کر دیا ہے۔ یہ ذاتوں اور قبیلوں میں بٹی انسانیت آج مرگ مفاجات میں مبتلا ہے۔

مجرم۔! یہ وقت نہ تو تقریر کا ہے اور نہ جرح و بحث کا میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جو وقت تمہارے پاس بچا ہے اس میں اگر تم اپنی صفائی میں کوئی بات کہنی چاہتے ہو تو کہہ جاؤ۔!

حضور والا۔! مجھے اپنی صفائی میں نہ پہلے کچھ کہنا تھا اور نہ اب۔ خواہش بس اتنی ہے کہ آپ مجھ پر عائد کردہ فرد جرم مجھے ایک بار پھر سنا دیں تا کہ میں یہ دیکھ سکوں کہ میں نے اپنے قلم کار ہونے کی ذمہ داری نباہی ہے یا نہیں۔ اگر اس میں کچھ کمی رہ گئی ہو گی تو میں اسے پوری کروں گا۔

اور۔ اگر تمہیں اس کا موقع نہیں ملا تو۔؟

تو پھر اپنے اس محسن سے جس نے مجھ کو قلم کی یہ دولت بطور امانت عطا کی ہے معافی مانگ لوں گا۔!

مجرم۔! تمہاری اس تمنا کو میں آخری تمنا سمجھ کر پوری کر دیتا ہوں لیکن یاد رہے اس کے بعد تمہیں کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہو گی۔!

مجھے منظور ہے۔!

تو لو سنو۔!

تم نے ایک کہانی میں یہ لکھا ہے کہ دنیا میں سرمایہ پرستی عزت افزائی کا سبب بن سکتی ہے لیکن سرمایہ کی یہ پرستش اس سرمایہ پرست کو ایک دن مجرم کے کٹہرہ میں کھڑا کر دے گی۔ یہ لکھ کر تم نے ان معزز ہستیوں کی توہین کی ہے جو اس دنیا کو تجارتی منڈیوں اور صنعتی اداروں کے سہارے خوبصورت اور بہتر بنانے میں مصروف ہیں۔ یہ لوگ پورے نظام معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی انجمن نے تم پر ہتک عزتی کا مقدمہ

درج کرایا ہے۔!

تم یہ کہتے ہو کہ دنیا کی ساری بدامنی اور بے چینی کا سبب خدا بیزارانہ نظام زندگی ہے۔تمہارے اس جملہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تم مروجہ طرز زندگی کے باغی ہو اور ہوس اقتدار میں مبتلا ہو۔اس لئے ایک ذمہ دار سرکاری محکمہ نے تمہاری تخلیقی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی سفارش کی ہے۔

تم نے یہ بھی لکھا ہے کہ مذہب کے نام پر تجارتی ادارے ہر جگہ کھلے ہوئے ہیں اور کھلتے چلے جارہے ہیں۔جس کی وجہ سے خدا ترسی کا حقیقی تصور گم ہوتا چلا جارہا ہے۔ان تاجروں سے عوام کو ہوشیار رہنا چاہئے۔تمہاری یہ بات ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو متاثر کرسکتی ہے۔عوام کا اعتماد ان بزرگوں اور مہنتوں پر سے ختم ہوسکتا ہے جو سماج کی نکیل پکڑ کر اسے اپنے پیچھے چلارہے ہیں۔سماج میں اگر ان کے خلاف بیداری پیدا ہوگئی تو اس سے نقص امن کا خطرہ ہے۔انتظامیہ یہ چاہتی ہے کہ خالق ومخلوق کے درمیان یہ پردہ حائل رہے۔!

اور تمہارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ تم لکھتے ہو۔مقننہ،انتظامیہ اور عدلیہ کو عوام کا وفادار اور عوامی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہونا چاہئے۔جبکہ ان تمام اداروں سے وابستہ افراد مفاد پرست اور خود غرض ہیں۔یہ جب تک بے لوث اور بے غرض نہیں ہوں گے ابن آدم کو حقیقی سکون نصیب نہیں ہوگا۔تمہاری یہ بات نظام عالم کی تبدیلی کی جانب اشارے کرتی ہے۔

تمہارے یہ سارے جرائم ایسے ہیں کہ ان کی سزا سے تم خود کو بچا نہیں سکتے۔اس لئے یہ معزز عدالت تمہیں حبس دوام کی سزا دیتی ہے اور یہ بھی تنبیہ کرتی ہے کہ اگر تم نے آئندہ ایسی کہانیاں لکھیں جن سے عوامی شعور کی بیداری کا اندیشہ محسوس کیا گیا تو تمہیں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دی جائے گی۔

منصف کا یہ فیصلہ سنتے ہی ملزم کی آنکھوں میں ایک حیرت انگیز اور مسرت خیز چمک نمودار ہوئی۔اس کے ہونٹوں پر ایک پروقار ملکوتی تبسم پھیل گیا۔لیکن عدالت میں موجود سارے لوگ پھوٹ پھوٹ کررونے لگے اور پھر سب کے سب عدالت کے کمرہ

سے سر جھکا کر باہر نکل گئے۔

منصف یہ تماشہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ فیصلہ پر دستخط کرنے سے پہلے ایک بار پھر ملزم سے مخاطب ہوا۔

مجرم۔! مجھے افسوس ہے کہ اب تم زندہ درگور ہونے جا رہے ہو۔ کاش تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہا ہوتا یا پھر آئندہ ایسی کہانیاں نہ لکھنے کا مچلکہ لکھ دیا ہوتا۔

حضور والا۔! آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں یہ اس نظام فکر سے متعلق ہے جس کے سایہ میں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے اور میں یہ سوچ کر مسکرا رہا ہوں کہ اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے سب سچ لکھا ہے۔ جب دنیا کی سب سے بڑی عدالت لگے گی تو اس دن آپ کا، میرا اور ان سارے لوگوں کا مقدمہ اس حاکم کے حضور پیش ہوگا جس کا فیصلہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔ جہاں نہ کوئی وکیل ہوگا نہ پیروی کار۔ جہاں حق گوئی کا انعام زنداں کے اندھیروں کی شکل میں نہیں فوز عظیم کی شکل میں ملے گا۔

اس دن آپ کا اور ان سارے لوگوں کا جن کی نظر میں میں آج مجرم ہوں کیا حشر ہوگا۔؟

کاش۔! اپنی جان دے کر بھی میں آپ تمام لوگوں کو اس دن کی پکڑ سے بچا لیتا۔ کاش۔!!!

پٹنہ ریڈیو سے نشر
مطبوعہ ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی

''میں کہاں جاؤں''

میری بیوی جو کچھ دیر سے کرسی پر کھڑی ہو کر دیوار کے روزن سے سڑک کا تماشہ دیکھ رہی تھی اچانک ایک چیخ مار کر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ کئی دنوں سے کچھ الجھی الجھی اور مضمحل سی تھی۔ رات بھر اسے سکون کی نیند نہیں آئی تھی اور میں ہر وقت اس کا یہ تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ کرسی سے بیہوش ہو کر گر نہ پڑے۔ میں اپنی چارپائی سے ہڑبڑا کر اٹھا۔

پہلا قدم اٹھانے سے قبل ہی میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر جو اس کے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا چھوڑ دیا اور کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا چلئے آج بھی بات آئی گئی ہو گئی۔ اس لئے پھر چارپائی پر دراز ہو کر وہ مضمون پڑھے گا جس کا عنوان تھا ''دنیا میں قیام امن کا مسئلہ''مضمون ذرا طویل تھا اور میں اس کے مطالعہ میں غرق تھا کہ اس درمیان یہ ذرا سی مداخلت (Intruption) کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ ذہن کی رو جو ایک ڈھنگ سے چل رہی تھی ذرا سی دیر کے لئے ڈسٹرب ہوئی تھی اس لئے میں خیال کے تانے بانے کو پھر سے سلجھا کر اس مضمون کی دنیا میں گم ہو جانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ لیکن بیوی کے بعد بچوں نے فکر کی رو کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنی شروع کر دی تھی۔ دراصل ان لوگوں نے اپنی ماں کی چیخ سنی تھی۔ سر پکڑ کر انہیں بیٹھتے دیکھا تھا اور وہ لوگ یکے بعد دیگرے ان کے اردگرد جمع ہو کر ان پر سوالوں کی بوچھار کر رہے تھے کہ آخر انہیں یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟

مجھے بچوں کا یہ ڈسٹرب کرنا گراں گذر رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ میری بیوی اس جگہ سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ چلی جائے تا کہ ان کی مزاج پرسی کرنے والوں کا قافلہ ان کے ساتھ میرے سامنے سے چلا جائے اور میں نامکمل مضمون کو مکمل کر سکوں۔ اس کے لئے میں

کبھی بچوں کو ڈانٹنا چاہ رہا تھا اور کبھی بیوی کو ہدایت دینا چاہ رہا تھا لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ سبھوں کو دم دلاسہ دیا جائے اور ہمت باندھ رکھنے کی تلقین کی جائے۔

میرا مکان شہر کی مشہور سڑک ''دین دیال اپادھیائے روڈ'' کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جس کا پرانا نام ''جامع مسجد روڈ'' تھا۔ آزادی کے بیس برس بعد جامع مسجد کے یہاں واقع ہونے کے باوجود اس کا نام بدل دیا گیا تھا۔ یہ سوال اپنی جگہ پر تھا کہ مسجد روڈ کا نام بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور نام کی یہ تبدیلی کس ذہنی اور تاریخی شعور کی تبدیلی کا پتہ دیتی ہے؟ اس سڑک کے دونوں کناروں پر کئی ذات، نسل اور فرقہ کے لوگ برسوں سے آباد ہیں۔ یہ سڑک اتر سے دکھن کی سمت جاتی ہے جس کے پچھمی کنارے پر مسجد واقع ہے اور مسجد کے آس پاس مسجد والوں کی آبادی ہے۔ اسی آبادی میں ایک گھر میرا بھی ہے۔

اس سڑک کے نام کی تبدیلی کے چند ماہ بعد ہی سڑک کے پوربی کنارے پر کچھ سکھ گھرانے نے آبسے تھے۔ یہاں بسنے کا فیصلہ شاید اس بنیاد پر کیا گیا تھا کہ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور نام کی تبدیلی پر کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا ہوا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں بہت ساری نوعیت کے بہت سارے ہنگامے بہت بار ہو چکے تھے۔ لیکن کبھی یہ گرم اور ناموافق ہوا ہمارے دیار میں داخل نہیں ہو سکی تھی۔ یہ بات کہ پڑھے لکھے او رکھاتے پیتے لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کا مزاج تو رکھتے ہیں لیکن متصادم نہیں ہو سکتے۔ یہاں صحیح معلوم ہوتی تھی۔ یہ محلہ دراصل اس شہر کی ''پاش کالونی'' ہے۔ یہاں کے رہنے بسنے والے سب لوگ کسی نہ کسی دفتر یا ادارہ میں قیمتی کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ ہیں یا پھر اچھے تجاّر ہیں۔ یہاں کی عورتیں ساڑی کی ڈیزائنوں، ٹی وی کی سائزوں، کاروں اور اسکوٹروں کے رنگوں، عمارت کی سجاوٹوں اور فرنیچر کی ناولٹی کے موضوعات پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا کرتی ہیں۔ اپنے اپنے شوہروں سے اسی موضوع پر بحثیں، پھر دوران بحث فرمائشیں کرتی جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ بچوں کا رنگ بھی عام رنگ سے جداگانہ تھا۔ صبح ٹیوشن کی میز شام سڑکوں پر چہل قدمی، جدید فیشن پر گفتگو، سنڈے کو پکچر اور فرصت کے دنوں میں پکنک یا سیر و سیاحت۔

یہ ہوا جو سمت غیب سے چلی اور جس نے سرور کا سارا چمن جلا دیا یہ اس محلّہ والوں کے لئے عام طور پر اور میری بیوی کے لئے خاص طور پر عجیب حادثہ تھا۔ وہ مجھ سے مصر تھی کہ کرفیو میں جیسے ہی ڈھیل دی جائے ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں۔ جب کہ آج کرفیو کا چوتھا دن تھا۔ صبح سے شام اور شام سے صبح لگاتار کرفیو۔ ہر طرف سکوت اور گہرا سناٹا۔ دن بھی رات کی طرح بھیانک۔ بیچ بیچ میں اذان کی آواز یا فائرنگ اور دھماکہ۔ یہی مختلف النوع آوازیں چار دنوں سے ہماری ہمدم و جلیس بنی ہوئی تھیں۔ اور انہیں آوازوں کے درمیانی وقفہ میں بیوی کا یہ اصرار کہ ہم لوگ بھی محلّہ چھوڑ چلیں۔ میں انہیں لگاتار سمجھا رہا تھا کہ یہ ہوا تمہارے خلاف تو نہیں۔؟ لیکن وہ میری یہ منطق تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ ہوا ان کے خلاف نہیں۔ وہ ہمیشہ بس یہی کہتی تھی کہ جو ہوا ایک بار چل چکی وہ اب بار بار چل سکتی ہے۔ کبھی اس کی زد میں دوسروں کا نشیمن ہے تو کبھی اس کی زد میں میرا بھی نشیمن آ سکتا ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آخر وہ کون سی جگہ ہے کہ جہاں پہنچ کر سکون پا جائیں؟ یہ پوری دھرتی اس وقت دہشت گردی کی گرفت میں ہے۔ اسباب جدا جدا سہی، نوعیت یکساں ہے۔ عصر حاضر کی زبان اسلحہ ہے۔ اس کی آواز دھماکہ ہے اور اس کے ساز سے ہر لمحہ اجل کا نغمہ پھوٹ رہا ہے۔ پوری انسانی آبادی اس عفریت کے دائرہ اختیار میں داخل ہوتی جا رہی ہے وہ کہتی کہ جن لوگوں کے نشیمن آج اجاڑے جا رہے ہیں کل تک وہ بھی تو یہی سوچ رہے ہوں گے۔ میں انہیں سمجھانا چاہتا کہ پناہ کی جگہ اب کوئی نہیں۔ یہ معاملہ جگہ کی تبدیلی سے حل ہونے والا نہیں۔ اس کا حل ذہن کی تبدیلی ہے وہ ذہن جو ''مسجد روڈ'' سے ''اپادھیائے روڈ'' کا سفر کر سکتا ہے وہ پھر مراجعت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ کیوں نہ ان متصادم لوگوں کو ''مسجد روڈ'' کی پاکیزگی بتائی جائے لیکن میری اس طرح کی بات انہیں اچھی نہیں لگتی۔ وہ کہتیں آپ عمر بھر ذہن کی تبدیلی کی بات کرتے رہیں گے اور آگ کبھی ایک گھر میں اور کبھی دوسرے گھر میں لگائی جاتی رہے گی۔ ان کے اس جواب کی سچائی قبول کرنے کے باوجود میں اپنی فکر کے اس انداز کو بدلنے میں ناکام ہو رہا تھا کہ ذہن کی تبدیلی سارے مسائل کا حل ہے۔ ذہن کے اندر صالحیت اور انسان دوستی جس دن پیدا ہو جائے گی سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ امن دراصل

انسانی ضرورت ہے۔ جنگ طول نہیں پکڑ سکتی جب کہ امن کو قیام وثبات حاصل ہو سکتا ہے۔

کئی دنوں سے چلنے والی ان باتوں کا یہ ایک نیا موڑ تھا۔ ایک نئی چیخ تھی جس نے میرے گھر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے سارے چھوٹے بچے سہمے سہمے سے تھے اور ماں سے لگاتار پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا اور میں ''دنیا میں قیام امن کا مسئلہ'' پڑھنے کی کوشش میں دوسری بار لگ چکا تھا کہ یہی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

دوسری طرف بیوی نہ اپنی جگہ سے ہٹ رہی تھی اور نہ کچھ بول رہی تھی۔ مجبور ہو کر میں اٹھا اور جا کر اس سے پوچھا کہ آخر کیا ہوا؟ تم نے روزن سے کیا دیکھا؟؟ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ وہ لوگ جو سامنے کے مکان میں رہتے ہیں ان کے پڑوسی ان کے گھر کی کواڑ توڑ کر اندر گھس گئے۔ ان کی چودہ سال کی بچی کو گھسیٹ کر بارہ لایا گیا اور اس کی دونوں جانگھوں کے درمیان سنگین بھونک دی گئی۔ مجھے لگا کہ ان ساری باتوں میں تضاد ہے۔ اس لئے میں نے پھر بیوی سے تفتیش کی کہ بالوں کی درازی سے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ آخر وہ دونوں تو ایک ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا رہن سہن ایک ہے۔ ان کی بزنس ایک ہے۔ ان کی گہری دوستی ہے اور وہ بچی تو ہمیشہ انہیں انکل کہا کرتی تھی۔ یہ ضرور تمہاری نگاہ کی خطا ہے۔ لیکن بیوی نے اپنی ساری بات دوہراتے ہوئے اپنی نگاہ پر پورے اعتماد کا اظہار کیا۔ پھر بھی میں نے ایک اور سوال کیا کہ سنگیں یا کوئی دوسرا ہتھیار۔؟ اس نے دوبارہ پر اعتماد انداز میں کہا کہ وہ کوئی دوسرا ہتھیار نہیں سنگین تھی۔ سنگین۔؟ اور انہیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی جن کی موجودگی کو آپ وجہ امن سمجھ رہے ہیں اور جن کی وجہ سے خود کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہیں۔

اسی درمیان سائرن کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے تفتیش حال کے لئے اسی روزن سے جھانکنے لگا۔ دیکھا سچ مچ ہمارے سامنے والے مکان کی بیحد خوبصورت چودہ سالہ بچی سڑک پر تڑپ رہی ہے۔ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے خون بہہ رہا ہے۔

دیکھتے دیکھتے کئی گاڑیاں یہاں آکر رک گئیں۔ مختلف رنگ کی وردیوں کے لوگ گاڑیوں سے اترے سامنے کے مکان میں داخل ہوئے۔ کھینچ کھینچ کر گھر سے لاشیں نکالنے اور سڑک کے کنارے جمع کرنے لگے پھر پڑوس کے ان لوگوں کا جن کے بارے میں میری

بیوی نے بتایا تھا دروازہ کھٹکھٹایا اور ان سے پوچھ گچھ شروع کردی۔ میں اپنی دیوار کے روزن سے یہ سارا تماشہ جو بیحد اندوہناک تھا کھڑا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ میرے گھر کی طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں کہ اچانک میری کنڈیاں بجائی جانے لگیں۔ میں باہر نکلا تو وردی والے سارے لوگ مجھے گھیر کر میرے دامن پر خون کے چھینٹے تلاش کرنے لگے۔ کچھ لوگ میرے گھر کے اندر گھس گئے۔ میں لرز گیا اور اپنا گھر خدا کے سپرد کیا لیکن جلد ہی سارے لوگ خالی ہاتھ واپس آکر میرے گرد جمع ہوگئے۔

سامنے کے وہ لوگ جن کے بچے میرے بچوں کے ساتھ اسکول جایا کرتے ہیں اور جن کی بیویوں سے میری بیوی کے گہرے مراسم تھے بیک زبان وردی والوں کو خون کا دھبہ میرے دامن پر تلاش کرنے کا اشارہ کرنے لگے۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں معلم پیشہ ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں اور اس وقت بھی میں محو مطالعہ تھا جب سائرن نہیں بجا تھا اور سارے لوگ پر سکون تھے۔ لیکن میری جانب اٹھنے والی انگلیاں لگاتار اٹھ رہی تھیں۔

میں عنقریب گرفت میں لیا جانے والا تھا۔ وردی والوں کی آواز میں کرختگی پیدا ہونے لگی تھی کہ اچانک اس بیحد خوبصورت لڑکی کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ وردی والوں نے اسے دیکھا سہارا دے کر بیٹھایا اور پانی پلایا۔ ابھی چند قطرے اس کے حلق کو تر کر سکے ہوں گے کہ اس کی زبان میں لرزش ہوئی اور اس نے کہا کہ میرا پورا گھرانہ پڑوسیوں کے ذریعہ تہہ تیغ کیا گیا ہے جو اس وقت دوسری طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں۔ یہ بیچارے تو شریف لوگ ہیں اور مجھے خود سنگین والوں نے مجروح کیا ہے

قبل اس کے کہ وہ بچی کچھ اور کہے میں اس بچی سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے یہ میری بیٹی ہے جو درندگی کی شکار ہوگئی ہے اور جسے اگر میں نے مارا نہیں ہے تو زندگی بھی نہیں دے سکا۔ پھر اس بچی کا سر میری گود میں ڈھلک گیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا ''پاش کالونی'' بھی اب محفوظ نہیں رہی۔؟

پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆ مطبوعہ ''سیارہ'' سالنامہ ۱۹۹۱ء، لاہور

سارے جہاں سے اچھا

آج پورے دس ماہ کے بعد کالج کھلا ہے۔ یوں تو کالج کی ملازمت اس لئے ہوا کرتی ہے کہ وہاں پیسے اور دیگر سہولیات حسب ضرورت نہ بھی ملیں ضرورت سے زیادہ فرصت ضرور مل جاتی ہے۔ فی زمانہ کاہل بنانے کا یہ سب سے اچھا کارخانہ ہے۔ لیکن اتنی طویل مدت تک کالج بند رہا تو یہ بات خود ملازمین کے لئے بھی تکلیف دہ رہی۔ طلباء کے لئے بھی اور اس علاقہ والوں کے لئے بھی۔

ہمارے علاقہ کا یہی ایک ڈگری کالج ہے جو ہر حیثیت سے معتبر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کے لڑکے ہفتہ میں دو بار آپسی جنگ کا شکار ہونے کے باوجود جاں کے زیاں سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ بندوق داغنے اور دیسی ساخت کے ریوالور اور کارتوس کی یہ بہترین آزمائش گاہ ہے۔ جہاں ماہ میں دو تین بار لازماً لڑکے اپنے تخلیق کردہ اسلحوں کی جانچ کرلیا کرتے ہیں اور تب اسے بازاروں میں فروخت کردیتے ہیں یا پھر جائز ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ان کا حسب ضرورت ناجائز استعمال رات کے اندھیرے میں یا دن کے اجالے میں کیا کرتے ہیں۔ اس طرح کے دھماکے اب اتنا معمول بن چکے ہیں کہ اس کی وجہ سے کبھی اس دن کی باقی گھنٹیاں ملتوی کردی جاتی ہیں یا پھر کبھی ایک دو دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہر دھماکہ کے بعد انتظامیہ کے افراد بھی لازماً آتے ہیں مختلف رنگوں کی مختلف بتیوں والی گاڑیاں بھی کئی دنوں تک آیا جایا کرتی ہیں اور پھر سب کچھ ایسا پرسکون ہو جاتا ہے جیسے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

کبھی کبھی کوئی چھوٹی سی بات طول پکڑلیتی ہے اور کتنے مفاد پرستوں کے مفادات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کالج کی موجودہ بندی اسی حقیقت کا ثبوت تھی۔ بات

صرف اتنی سی تھی کہ کالج کے سائنس اور آرٹس بلاک کے سامنے کا گڑھا جسے کالج کے آنجہانی سکریٹری نے سوئمنگ پول Swimming pool بنوانے کی نیت سے کھدوایا تھا۔ ان کی اچانک موت کے سبب وہ گڑھا گڑھا ہی رہ گیا۔ اب اس میں برسات کے دنوں میں پانی جمع ہو جاتا ہے اور جب شدید بارش کے عالم میں اس میں مینڈک کی ٹرٹراہٹ سے سُر تال کا سماں بندھ جاتا ہے تو سارے لڑکے اپنا اپنا کلاس چھوڑ کر ورنڈے پر آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مینڈکوں کا بدلتا رنگ، پھولتا جبڑا اور کود پھاند دیکھنے میں مگن ہو جاتے ہیں۔ ان کا وہ دن کالج کا سب سے زیادہ کامیاب دن ہوتا ہے۔ اس معاملہ میں لڑکیاں خود کو لڑکوں سے زیادہ خوش نصیب تصور کرتی ہیں کہ شدید بارش کی وجہ سے کوئی کلاس بھی ٹھکانے سے نہیں چل سکا۔ مینڈکوں کی توڑا مڑوری کا منظر بھی دیکھا اور گھر کی چولہا چکی سے بھی نجات مل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے دنوں میں ان کی چہچہاہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ سینکڑوں مینڈک کی آواز زیادہ تیز ہے یا ان سو پچاس لڑکیوں کی۔

یہ بات پچھلے سال کی برسات کی ہے کہ اب دوسری برسات کا پانی پھر برسنا شروع ہو چکا ہے اور کالج آج دس ماہ کے بعد کھلا ہے تو اس کی ساری رنگینیاں واپس آگئی ہیں۔ بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ گڑھا میں جمے ہوئے برسات کے پانی میں پاس پڑوس کے کسانوں نے اپنا اپنا پٹسن دبانا اور دھونا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر چند دنوں کے لئے کالج بند ہو گیا۔ کالج کھلتے ہی جب اساتذہ اور طلباء نے کالج میں قدم رکھا تو ہر طرف سرانڈ پھیل چکی تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ جانور جا بجا نہ صرف یہ کہ مر گئے ہیں بلکہ ان کا جسم بھی سڑ چکا ہے۔ چند دنوں کے بعد کالج کھلا تھا تمام ملازمین اور طلباء کو ایک نیا موضوع ہاتھ لگا۔ اسٹاف روم اور کامن روم دونوں جگہ اس مسئلہ پر زوردار بحثیں ہونے لگیں۔ آخر میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ یہ سب پرنسپل کی نااہلی کی وجہ سے ہوا ہے جو خود اس سرانڈ سے پریشان تھے گھیراؤ کی اومس میں پھنس کر اور بھی مضطرب ہو گئے اور انہوں نے فوراً ایک نوٹس دے دی کہ آئندہ دس دنوں تک کالج بند رہے گا۔ اور اس نوٹس کی اطلاع یونیورسٹی کو بھیج دی گئی۔ یونیورسٹی نے انتہائی چستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین افراد پر مشتمل

ایک جانچ کمیشن تشکیل کی جس میں اساتذہ کے نمائندہ، طلباء کے رہنما اور ایک سرکاری افسر کو شامل کیا گیا۔ کالج بند ہونے کے تیسرے ہی دن کمیشن نے کالج پہونچ کر جانچ کا کام شروع کردیا۔ تمام کمروں کا جائزہ لیا گیا۔ چھتیں دیکھی گئیں میدان کے اردگرد کی تلاشی ہوئی اور تب پورے ایک ہفتہ بعد یہ رپورٹ یونیورسٹی کے سامنے رکھی گئی کہ دراصل کالج میں جو گڑھا ہے اس کا پانی سڑ چکا ہے۔ جس کی وجہ سے سرانڈ ہے۔ اگر اس کا مناسب انتظام نہیں کیا گیا تو شدید قسم کی بیماریاں پھیل سکتی ہیں۔ لیکن یہ کمیشن یہ نہیں بتا سکی کہ آخر پانی سڑا کیسے؟ اس لئے یونیورسٹی نے اگلے پندرہ دنوں تک کالج کے بند رکھنے کا حکم بھیجنے کے ساتھ تین افراد پر مشتمل ایک دوسری کمیشن بحال کردی گئی جو ڈاکٹر انجنیئر اور کیمسٹ پر مشتمل تھا۔ کیمسٹ کو پانی کی جانچ کرنی تھی۔ ڈاکٹر کو امراض متوقع کا اندازہ لگانا تھا اور انجنیئر کو یہ ناپ کر دیکھنا تھا کہ گڑھا کی کیا وسعت ہے اور اس میں پانی کی مقدار کیا ہے؟ یہ سارا کام پہلے کام سے بھی زیادہ وقت مانگتا تھا۔ اس لئے اس ٹیم نے یہاں آنے کے بعد یونیورسٹی کو پہلی سفارش یہ بھیجی کہ کالج کو کم ازکم ایک ماہ کے لئے بند کردیا جائے۔ یونیورسٹی نے فوراً دوسرا حکم نامہ بھیج کر کالج کی بندی کی مدت میں توسیع کر کے اس نئی ٹیم کو اطمینان سے کام کرنے کی مہلت عطا کردی۔ پورا ایک ماہ گذرنے کے بعد اس ٹیم نے یہ دریافت کرلیا کہ اس سرانڈ کا اصل سبب گڑھا میں پٹ سن کا دھویا جانا ہے لیکن اتنی لمبی مدت گذرنے کے بعد اب سرانڈ تقریباً ختم ہوچکی ہے اس لئے کالج دس دن کے بعد کھولا جاسکتا ہے۔

یونیورسٹی نے اس جانچ رپورٹ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد پرنسپل کو یہ ہدایت ارسال کی کہ فوری طور پر ڈے گارڈ اور نائٹ گارڈ کو سسپنڈ (Suspend) کردیا جائے کہ ان کی موجودگی میں کالج کے گڑھے میں پٹسن دھونے کا غیراصولی کام ہوا۔ ان گارڈوں نے جب یہ عذاب اپنے سر پر آتا ہوا محسوس کیا تو اس نے ان کسانوں کی گردن پکڑی جن کی یہ حرکت تھی۔ کسانوں نے پہلے تو معافی طلب کی لیکن جب نجات کی کوئی شکل انہیں نظر نہیں آئی تو ایک گرگ باراں دیدہ سیاست داں کے پاس پہونچا جس نے اسے ایک عقل کی بات سمجھادی۔ رات کے اندھیرے میں آکر اس نے ایک مقدس جانور کا سر اس

سڑے ہوئے پانی میں کئی اینٹوں کے تلے دبا دیا اور پھر وقت کا انتظار کرنے لگا۔ زمین سے نکلنے والے آتش فشانی دیوتاؤں کی طرح دوسرے ہی دن اس جانور کی سینگوں نے پانی کی سطح پر آنکھ مچولی شروع کردی۔ ڈے گارڈ نے اسے دیکھا تو فوری طور پر اس کے اس کی اطلاع انچارج صاحب کو دی۔ انچارج صاحب ایک مذہبی آدمی تھے پہلے تو انہوں نے اسے بھگوان کی مایا سمجھا اس لئے کئی احباب کو خبر بھیجی۔ ان میں ان کے وہ دوست بھی شامل تھے جو سیاست کی آڑ میں فرقہ وارانہ تعصبات پھیلانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سب لوگ مل کر اس نئے تماشہ کی تحقیق کو پہونچے۔ ان حضرات کے پہونچتے پہونچتے اس مقدس جانور کا پورا سر سطح آب پر تیرنے لگا تھا۔ انچارج صاحب کے ساتھ آنے والا ان کا وہ ساتھی جو ایک تشدد پسند سیاسی جماعت کا رکن تھا اس نے فوراً ایک فوٹو گرافر کو بلایا۔ تیرتے ہوئے سر کی تصویر لی اور اپنی تصویر اس میں جوڑ کر اخبار میں یہ خبر بھیج دی کہ مسلمانوں نے کالج کے گڑھے میں مقدس جانور کو ذبح کر کے پھینک دیا ہے۔ اس سیاسی رہنما کے ایک دوسرے ساتھی نے موٹر سائیکل پر بھاگ کر یہ خبر قرب وجوار کی آبادیوں میں اس اضافہ کے ساتھ پہونچائی کہ وڈیا مندر کا یہ اپمان پوری سبھیتا اور سنسکرتی کے لئے ایک چنوتی ہے اس کے لئے ہم لوگوں کو ایکتا بدھ ہونا پڑے گا اور اپنے دھرم کی رچھا کے لئے ایک جٹ ہو کر بدیسی جاسوسوں سے یدھ کرنا ہوگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالج کے چاروں طرف کے لوگوں نے اس گڑھا کو زیارت گاہ بنالیا اور تب بھاگ کر ضلع انتظامیہ کے افسران پہونچے۔ انٹیلیجنس (Inteligence) کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ کالج کے مسلم ملازمین پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ پولیس کے پہرے بٹھائے گئے۔ یہاں تک کہ نیم فوجی دستے تعینات کردئے گئے۔ بازار بند ہوگیا۔ ہر طرف ایک دہشت اور خوف کی فضا طاری ہوگئی۔ اس کے بعد ایک دوسرے سیاسی رہنما نے یہ سجھاؤ ضلع انتظامیہ کے سامنے رکھا کہ اس مقدس سر کو بہ اعزاز سپرد خاک کردیا جائے۔ اس گڑھا کا سارا پانی پھینکوا دیا جائے۔ اس کے گرد و پیش بتیاں لگا دی جائیں۔ خوبصورت پیڑ پودے نصب کردئے جائیں اور اس پر ایک سال تک پولیس کا پہرا بٹھا دیا جائے۔ ضلع انتظامیہ کو یہ ساری تجاویز پسند آئیں کہ امن وامان کی بحالی ان کی نظر میں

سب سے زیادہ اہم تھی اور تب انجنیر وں نے دس لاکھ روپے کا کل تخمینہ پیش کیا۔ تخمینہ فوری طور پر منظور کرلیا گیا۔ ٹنڈر ہوا اور وہی لوگ جو کل دھرم کی دہائی دے رہے تھے اور ضلع انتظامیہ کو مشورے دے رہے تھے آج بڑھ چڑھ کر ٹنڈر بھر رہے تھے۔ کالج کھل چکا تھا۔ ہر طرف سکون تھا۔ چہل پہل تھی۔ ہریالی تھی۔ گڑھا میں نئی برسات کا نیا پانی بھر دیا تھا اور مینڈکوں نے پھدکنا شروع کر دیا تھا۔ اسٹاف روم سے اساتذہ کے اور طلباء و طالبات کے کامن روم سے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور میں اپنے شعبہ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ہمارا ملک بھی کیا خوب ملک ہے؟ واہ۔ بہت خوب۔ بہت خوب

سارے جہاں سے اچھا.....................

ہندوستاں ہمارا.........................

پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆

مُجرم

ہر آدمی ایک کہانی ہے۔اسی لئے وہ ہمیشہ سے کہانی سننا پسند کرتا رہا ہے۔کبھی وہ اپنی کہانی سننا پسند کرتا ہے اور کبھی دوسروں کی۔لیکن جب کسی کہانی میں کوئی آدمی خود تماشہ بننے والا ہوتا ہے اس وقت ہر شخص کی آرزو بس یہی ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ تماشہ بنیں اور وہ محض تماشائی ہو۔اس کے برخلاف جب کسی مثالی شخصیت کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے تو ہر شخص کی آرزو منہ پھاڑے کھڑی ہوتی ہے کہ شہرت کا قطرۂ نسیاں صرف اور صرف اسی کے حلق میں گرے۔لیکن اس مسلمہ حقیقت اور قاعدہ کلیہ سے ذرا ہٹ کر میں ایک ایسے شخص کی کہانی آپ کو سنانے آیا ہوں جسے خود یہ احساس کبھی نہیں ہوا کہ وہ کہانی بننے والا ہے اور اس کا کردار مثالی کردار بن جانے والا ہے۔

میں کبھی کبھی یہ سوچ کر اپنے آپ پر خوب ہنستا ہوں کہ میرا یہ بھی عجیب معیار انتخاب ہے کہ اس دنیا میں میرے رشتہ دار وہی لوگ ہیں جو حصول دنیا سے بے نیاز ہیں اور حلقہ احباب میں وہی لوگ داخل رہے جو یہاں مال و منال اور جاہ و حشم سے محروم رہ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دل ارمانوں کا مدفن اور خواہشات کا مذبح بن کر رہ گیا۔

وہ میرا ایک ایسا دوست تھا جو وقت کی ایک عجیب سی گھڑی میں آکر مجھ سے چپک گیا تھا۔ حالانکہ نہ میں نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ خود اس نے مجھے پانے کی آرزو کبھی اپنے دل میں پیدا کی ہوگی۔فلمی معاشقہ کی طرح میرے اور اس کے تعلق کا آغاز ہوا۔ہمارا شہر ریلوے کے ایک بڑے جنکشن کا شہر ہے۔ریل کی یہ دنیا بھی کچھ عجیب سی دنیا ہوتی ہے۔یہاں کے لوگ اپنی عمر بھر نہ سو پاتے ہیں اور نہ جاگ سکتے ہیں۔جب جاگنے کا وقت ہوتا ہے تو یہ لوگ سونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں اور جب سونے کا مرحلہ آتا ہے تو یہ لوگ جاگنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ان گنت لوگوں سے ان کی ہر روز

ملاقات ہوتی ہے لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہوتا جسے یہ اپنا کہہ سکیں یا جوان کو اپنا کہہ سکے۔ اس بے چارگی اور بے کسی کا درد ان کے دلوں میں کچھ اس طرح اپنا گھر بناتا ہے کہ یہ اسی درد میں لذت محسوس کرنے لگتے ہیں اور زندگی کو اپنے ڈھب پر جو عام لوگوں کی نظر میں بے ڈھب ہوتی ہے گذارنے لگتے ہیں۔ لیکن اس بے ڈھب زندگی میں بھی ایک ڈھب کی بات قدر مشترک کی طرح سب کے درمیان موجود ہوتی ہے اور وہ قدر مشترک ہے حصول زر۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ جب انہوں نے زندگی کا سارا رنگ پھیکا کر دیا تو ذرا یہی رنگ چوکھا آئے۔ مسافر جو کسی بھی معیار کا ہو جب راہ میں ہے تو رحم کا مستحق ہے لیکن یہی مسافران کی چراگاہ ہے۔ ضروریات زندگی کے سارے سامان، جو رسل و رسائل کے مرحلہ میں ان کی امانت ہوا کرتے ہیں ان کی دست برد سے محفوظ نہیں رہتے۔

ایسے ہی ماحول میں وہ شخص بھی جی رہا تھا جو میرا دوست بننے والا تھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ وہ بس یہی جانتا تھا کہ ایک دن اسے اس دن سے واسطہ پڑنے والا ہے جو ایک ہزار سال کے برابر کا ہوگا۔ اس دن وہ منصف اعلیٰ جو پورے تدبر سے ان سارے کارخانوں کو چلا رہا ہے۔ ذرہ ذرہ کا حساب دیکھے گا اور گن گن کر اس کا بدلا چکائے گا وہ شخص اس جنکشن کے اعلیٰ ترین افسروں میں سے ایک تھا۔

اس دن مجھے ایک لمبے سفر پر جانا تھا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر ہمیشہ کی طرح آج بھی نہیں آرہی تھی۔ میں انسانوں کے اس جم غفیر میں اجنبیت کا غم غلط کرنے کی غرض سے مختلف دفاتر کے در و دیوار سے آشنائی پیدا کرنے کی مہم میں لگا تھا کہ میری نظر اس نیم پلیٹ پر جا کر ٹھہر گئی جس پر لکھا تھا ''محمد معراج صدیقی۔ اے۔ سی ایس۔'' میں اس نیم پلیٹ کو ابھی پڑھ ہی رہا تھا کہ اندر سے ایک انتہائی سادہ اور پر وقار شخص نمودار ہوا۔ سامنے آتے ہی اس نے کہا ''السلام علیکم''۔

مجھ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ جناب ایم۔ ایم۔ صدیقی آپ ہی ہیں۔ میرے استفسار پر انہوں نے جواباً میرا تعارف چاہا اور یہ کہتے ہوئے مجھ کو اندر لے گئے کہ اس وقت میں بھی عازم سفر ہوں اور اسی گاڑی کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا

کہ آج میں نے اپنی چھٹی کی درخواست گذار دی ہے۔ لیکن یہ سوچ کر کہ فرصت کے لمحات کو ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ دفتر کی کچھ فائلیں دیکھ لی جائیں۔ اس وقت اسی لئے یہاں آ گیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اب بھی ایسے ذمہ دار لوگ ہمارے ملک میں موجود ہیں۔؟

اسی درمیان ٹرین کی آمد کی منادی ہوئی۔ پھر ٹرین آئی اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم سفر بن گئے۔ یہ ہم سفری چند گھنٹوں کا نہیں کئی برسوں کا تھا۔ چنانچہ جب ہم دونوں جدا ہوئے تو اس عزم مصمم کے ساتھ کہ انشاء اللہ پھر ملیں گے اور ضرور ملیں گے۔ جب میں اپنے سفر سے واپس آیا تو یہ خبر ملی کہ مسٹر صدیقی کو پروموشن دے کر ڈی۔ سی۔ ایس بنا دیا گیا اور وہ ڈیویژنل ہیڈ کوارٹر منتقل ہو گئے۔ یہ سن کر خوشی ہوئی لیکن یہ صدمہ بھی رہا کہ مسٹر صدیقی کی رفاقت بڑی لمحاتی تھی۔

اب میرا یہ معمول تھا کہ ہر آنے جانے والے سے مسٹر صدیقی کی خیریت پوچھ کر دل کو اطمینان دے لیا کرتا۔ لیکن میں آج آپ کو دکھ کے اس اتھاہ سمندر میں کھینچ کر لا رہا ہوں جس میں کئی دنوں سے میں غوطہ زن ہوں۔

ابھی چند دنوں کی بات ہے۔ میرے دوست مسٹر خان نے مجھے بتایا کہ صدیقی اپنے گھر واپس چلے گئے۔ میں نے پوچھا ابھی تو ان کی ملازمت کے کئی برس باقی تھے۔ کہنے لگے جی ہاں! انہیں جبریہ برطرفی سے واسطہ پڑا۔ اس جواب نے میری حیرانی میں مزید اضافہ کر دیا۔

میں نے مسٹر خان سے کہا پہیلیاں بجھانے سے بہتر ہے کہ مجھے ساری تفصیلات بتا دو۔ وہ تو ایک مخلص آدمی تھا، محنتی تھا، فرض شناس تھا۔ پھر یہ جبریہ برطرفی کیسی؟ مسٹر خان نے کہا۔ سب کچھ تھا لیکن وہ ایک مجرم بھی تھا۔ مجرم۔؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ کیسا مجرم۔؟ جی! یہ آپ کو معلوم نہیں۔

میں ایک عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ میں جس شخص سے ملا تھا کیا وہ ایک مجرم تھا۔؟ کیا مجرم کی زبان میں اتنی مٹھاس ہوتی ہے؟ کیا وہ بظاہر خلوص کا پیکر نظر آتا ہے؟ کیا وہ سفید جھوٹ بولنے والا ہوتا ہے۔؟ میں سوچنے لگا اسی وقت کوئی ٹرین پکڑ کر میں اس کے گھر چلا جاؤں اور اس کا گریبان کھینچ کر اس سے پوچھوں کہ تم نے اپنے جرم کو چھپانے کا یہ سب ہنر کس

سے سیکھا ہے؟ مجھے تم اپنے اس استاد کا نام بتاؤ کہ میں اسے سولی پر چڑھادوں اور اس مکتب کو نیست و نابود کردوں جہاں تم جیسے مکار جنم لیتے ہیں۔ اور تب میں نے سفر کا مصمم ارادہ کرلیا۔

اسی درمیان مسٹر خان پھر گویا ہوئے۔ جانتے ہیں مسٹر صدیقی کا جرم کیا تھا۔

میرا دل چاہا کہ مسٹر خان کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں کہ وہ جرم میں نہ سن سکوں اس لئے کہ اس شخص کی عظمت کا جو محل ابھی میرے ذہن میں مسمار ہوا تھا اس کی بنیاد ابھی باقی تھی۔ پھر بھی میں نے خاطراً اُبجھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ کیا تھا؟ مسٹر خان نے کہا۔ وہ شخص صدفی صد ایماندار تھا۔ ایماندار اور جرم یہ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں مسٹر خان؟

جی ہاں۔ میں وہی بات کہہ رہا ہوں جو سچ ہے۔ آج کے زمانہ میں ہمارے یہاں ایمانداری جرم ہے۔!

وہ کیسے۔؟ میں نے فوراً استفسار کیا۔؟

لیجئے سنئے وہ کیسے۔! صدیقی صاحب کا تبادلہ جس ڈیویزن آفس میں ہوا تھا اس ڈیویزن کی حدود میں تقریباً بیس بڑے بڑے کارخانے تھے۔ ایک ماہ کے اندر جب انہوں نے تمام اہم فائلوں پر نظر ڈالی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان بڑے کارخانہ داروں کے یہاں ریلوے کا لگ بھگ ایک کڑور روپیہ باقی ہے اور ریل کی خدمات بدستور جاری ہیں۔ انہوں نے روپے کی وصولی کا حکم دیا۔ دفتر سے ابھی حکم نامہ نکلا بھی نہیں تھا کہ ایک صاحب ایک دن دفتر میں داخل ہوئے اور زوردار سلام ٹھونکا۔ دریافت حال پر نووارد نے بتایا کہ وہ ایک مسلمان کارخانہ دار کے نمائندہ ہیں۔ پھر ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ فی الوقت ہماری کمپنی بقایا کی ادائیگی سے معذور ہے۔ مالک نے یہ رقم حضور کے بچوں کی مٹھائی کے لئے بھیجی ہے اور انشاء اللہ ہر ماہ اتنی ہی رقم حضور کے یہاں بلا ناغہ پہنچ جایا کرے گی اس لئے کہ یہی یہاں کا معمول رہا ہے۔ صدیقی صاحب نے کہا کہ میرے بچے تو ایک برس میں بھی ایک ہزار روپے کی مٹھائی نہیں کھاتے ہیں۔ یہ ہر ماہ اتنی مٹھائی کھا کر کیا کریں گے؟ آپ یہ رقم مالک کو واپس کردیں اور کہہ دیں کہ ایک ماہ کے اندر وہ بقایا رقمیں ادا کردیں۔ میں انہیں قسط کی سہولت دے سکتا ہوں۔ نووارد منہ لٹکا کر واپس ہوگیا۔

دوسرے دن جے ''ست سری اکال کی'' کہتے ہوئے ایک سردار جی داخل ہوئے اور اسی طرح کا مدعا کچھ اس سے زیادہ بھاری بھرکم انداز میں پیش کیا۔ صدیقی صاحب نے سردار جی کو بھی ویسا ہی جواب دیا۔ سردار جی نے بھی اپنے صوبہ کا رونا رویا اور تجارت کی کساد بازاری کا واسطہ دیا ساتھ ہی ساتھ بچوں کی مٹھائی کی رقم میں اضافہ کا اشارہ بھی کیا لیکن صدیقی صاحب نے ایک نہ سنی۔

اگلے ہفتہ کئی لوگ نمسکار، ہرنام اور آداب کی بوچھار کرتے ہوئے آئے اور ایک نئے بریف کیس میں نئے نوٹوں کے بیس ہزار روپے کے بنڈل پیش کرتے ہوئے گویا ہوئے۔ سر! پارسل آفس کے بابو کی ''معمولی'' دس بیس روپے ہوتی ہے اور اس دفتر کے صاحبوں کی معمولی بیس سے پچیس ہزار روپیہ ماہانہ ہوا کرتی ہے۔ ہم لوگوں نے گرانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ طئے کیا ہے کہ اسے بڑھا کر تیس ہزار روپیہ ماہانہ کر دیا جائے۔ لیکن صدیقی صاحب نے ان لوگوں کو بھی وہی جواب دیا۔ یہ سب لوگ وہاں سے طیش آمیز مایوسی کے عالم میں نکلے۔ اس آخری واقعہ کو ابھی تین ماہ بھی نہیں گذرا تھا کہ صدیقی صاحب کو پروانہ ملا۔ ''آپ ملازمت سے سبکدوش کر دئے گئے۔''

یہ جبریہ سبکدوشی تھی۔ جس کی کہیں کوئی سنوائی نہیں۔ میں نے پوچھا۔ اس فیصلہ کا بہت شدید اثر صدیقی صاحب نے قبول کیا ہوگا۔؟

مسٹر خان نے کہا۔ نہیں جناب وہ بالکل پرسکون اور مطمئن تھے۔ کہہ رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کوئلہ کی کان میں رہ کر بھی میں نے اپنے دامن کو سیاہ ہونے سے بچا لیا۔

میں بے ساختہ چیخ اٹھا۔

واہ میرے دوست۔ شاباش۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔

اور تب میں نے اپنے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ قلم کو اذن سفر دیا کہ اس دنیا کے ہم بے مایہ لوگ ایسی عظیم شخصیتوں کے قدموں میں لفظوں کی اس سوغات کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں۔؟؟؟

☆☆

پٹنہ ریڈیو سے نشر

آخری کہانی

''ہاں بھائی! وہ کیا ہوا؟ بہت دنوں سے بونس کا چرچہ چل رہا ہے''۔؟

''سنا ہے آرڈر چل چکا ہے''۔

''جب آرڈر چل چکا ہے تو پھر اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ کیا اب تک آرڈر یہاں نہیں پہونچا ہے۔''؟

کیا کہتے ہو بھائی! اب تو تمام گاڑیاں دیر سے چلا کرتی ہیں۔ آخر ریل ہی کا تو کام ہے؟ آرڈر بھی تو انہیں گاڑیوں سے چل کر آئے گا۔؟

''ارے نہیں صاحب! یہ کہئے کہ ریل کے کرمچاری بے جان ہیں اس لئے ان کا ہر معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ اب یہی سوچو نا کہ اگر تہوار سے پہلے بونس مل جاتا تو بیچارے کرمچاریوں کا کتنا بھلا ہو جاتا۔''

''بات تو ٹھیک کہتے ہو مشرا جی۔ لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اوپر والوں کو نیچے والوں کی فکر کب رہی ہے؟ وہ لوگ تو اپنا مال بنانے کے پھیرے میں لگے رہتے ہیں۔!''

''مال بناتے ہیں یہ ٹھیک ہے لیکن بونس کا آرڈر آنے میں ان کے اوپر والوں کا کوئی قصور نہیں۔ یہ کہیں بیچ میں ہی پھنس گیا ہے۔ سنا ہے کہ آج کل میں آنے ہی والا ہے۔''!

''ارے آج کل تو بہت دنوں سے سن رہا ہوں۔ یہ جو تم نے کہا نا کہ ساری گاڑیاں ہی اب لیٹ چلا کرتی ہیں۔ وہی بات سچ ہے۔ آرڈر چلا ضرور ہے لیکن کہیں لیٹ ہو رہا ہے۔ اسے بھی سگنل نہیں مل رہا ہوگا۔''!

''دیکھو مشرا جی! اس بات کو تو مانو گے کہ اب سے پچیس تیس برس پہلے ریل کا معاملہ اتنا خراب نہیں تھا۔ وہ زمانہ یاد کرو جب ہم لوگوں کی نوکری نئی نئی تھی اور دیش نیا نیا

آزاد ہوا تھا۔ سارے لوگ کتنی محنتیں کیا کرتے تھے۔ یہ جو نئے نئے لڑکے سب اب نوکریوں میں آئے ہیں ان میں سے زیادہ تر لوگ کام کرنا ہی نہیں چاہتے ہیں''۔

''کام خاک کریں گے۔ انہیں تو کوئی کام آتا بھی نہیں ہے''۔

یہ صحیح ہے کہ انہیں کوئی کام نہیں آتا ہے لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ان کے دل میں کسی کام کو سیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔

''ارے دیکھو دیکھو! آج وہ بھی کہیں جا رہا ہے۔ جانتے ہو اس نے پچھلے ایک سال میں کم از کم پچاس لاکھ روپیہ کمایا ہوگا''۔

''ہاں یار سنا تو میں نے بھی ہے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اب اس کا تعلق بہت بڑے اسمگلر گینگ سے ہو گیا ہے۔ سارے ملک میں اس گینگ کا جال بچھا ہوا ہے''۔

''ارے نہیں بھائی! صرف ہندوستان ہی نہیں اب تو اس کا تعلق انٹرنیشنل گینگ سے ہے۔ اس لئے تو اس نے صرف ایک سال میں پچاس لاکھ روپے سے بھی زیادہ کما لیا''۔

''ارے یار کیا سرکار اسے پکڑ نہیں سکتی۔؟

''یہی تو کمال ہے کہ ان لوگوں کو دولت کمانے کی عقل جو آئی ہے تو سیاست بھی آگئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اس کا چاروں بھائی چار سیاسی جماعتوں کا سرگرم کارکن ہے۔''

''ہاں یہی سمجھ لو۔ جہاں کسی سرکاری افسر نے کسی ایک پر نظر کڑی کی فوراً اس افسر کے خلاف ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے کہ اس کی ساری کاروائیاں سیاسی مقصد کے پیش نظر ہو رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیچارہ افسر بھی آنکھیں موند لیتا ہے''۔

''ٹھیک کہتے ہو پچھلے سال جو پورے ملک میں مارا ماری ہوئی تھی اس موقع پر اس کا دوسرا بھائی جگہ بہ جگہ بڑی گرم گرم تقریریں کیا کرتا تھا''۔

اور جانتے ہو۔ تیسرا بھائی اس کے بعد ریلیاں نکال نکال لوگوں کو امن وشانتی قائم کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا''۔

''چوتھے کے بارے میں یہ خبر ملی ہے کہ وہ کئی ممالک کی سیر کو جا رہا ہے اور اس

سیر میں اس کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ ہر جگہ وہ سرکاری مہمان بنا رہے گا۔''

''شاباش۔ تب تو اس کی پانچوں انگلی گھی میں ہوگی۔''

ہاں یار! یہی تو وہ راز ہے کہ جس کی وجہ سے ان لوگوں نے صرف ایک سال میں پچاس لاکھ روپیہ کمالیا۔ پچاس لاکھ''۔

''کمال کرتے ہیں بھائی صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ جب تک تمام اپوزیشن پارٹیاں ایک جٹ نہیں ہو جائیں گی اس ملک میں انقلاب نہیں آسکے گا۔''

''مہاشئے آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ یہاں اپوزیشن کے ایک جٹ ہونے کا کبھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔ یہاں سب کو اپنی دفلی اپنا راگ پیارا ہے۔''

''اجی حضرات! آپ لوگ اسی طرح مونچھ پر تاؤ دیتے رہیے۔ اس وقت ملک میں جو سیاسی صورت حال ہے اسے سمجھنا بے حد مشکل ہے۔ دراصل غیر ملکی طاقتیں یہاں اپنا پورا زور صرف کر رہی ہیں کہ ان کا اقتدار کسی طرح یہاں قائم ہو جائے۔ کوئی اسے دائیں طرف کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے تو کوئی بائیں۔ اور یہی جنگ تو ہمارے پاس پڑوس کے ملکوں میں بھی چل رہی ہے۔ یہاں کی تمام سیاسی جماعتیں اس کھینچا تانی میں لگی ہیں۔''

''لیکن مولانا! یہ بھی تو دیکھئے کہ ایک طرف کھینچا تانی چل رہی ہے تو دوسری طرف مال بنانے کا دھندھا بھی چالو ہے۔''

''ہاں ورما جی ٹھیک کہتے ہو۔ کسی کو گدی سے اتارو، کسی کو گدی پر بٹھاؤ یہ سب اسی لئے ہو رہا ہے کہ مال بنانے کا موقع ملتا رہے۔ دیکھتے نہیں ہو قیمتیں آسمان چھو رہی ہیں۔''!

قیمتوں کی بات مت کرو۔ یہ تو ان ملازموں سے پوچھو جن کا سہارا صرف نوکری ہے۔ ان سے زیادہ دکھی زندگی اور کسی کی نہیں''۔

''ہاں ہاں بلاشبہ! چالیس برسوں میں ہم لوگوں نے اگر کوئی دولت جمع کی ہے تو وہ صرف دکھ درد کی دولت ہے اور قرض ہماری پونجی ہے۔''

میں جو کچھ دیر سے پلیٹ فارم پر ٹہل ٹہل کر ٹرین کی راہ دیکھنے والے مسافروں کی

باتیں سن رہا تھا یکا یک آخری شخص کے پاس ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے ہیں یہاں سے نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی سکت ہے اور پیچھے ہٹنے کا موقع بچوں کی ٹیوشن فیس، اسکول ڈریس، کتابوں کی قیمت، بوڑھے والدین کی گوناں گوں ضروریات، بیوی کی جائز خواہشات، سبھوں نے آکر میرے گھیرا بندی کر لی۔ میں سوچنے لگا یہ دکھ بھری دنیا کسی کو سکھ پہنچانے والی نہیں۔ سوا ان لوگوں کے جو جھوٹے ہیں، عیار ہیں، ظالم اور فریب کار ہیں۔

''یاتری گن دھیان دیں۔ تین ہزار ارسٹھ نمبر کی تیز سواری گاڑی جو گورکھپور سے چل کر دھنباد کو جاتی ہے پلیٹ فارم نمبر سات پر آرہی ہے۔ یہ گاڑی اپنے ٹھیک وقت سے چار گھنٹہ لیٹ چل رہی ہے۔''

اعلان ختم ہوتے ہوتے گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچنے لگی۔ سارے مسافر جو ٹولیوں میں بٹے محو گفتگو تھے بھاگم بھاگ گاڑی کے ڈبوں میں گھسنے لگے۔ دھینگا مشتی کرتے ہوئے اپنے اپنے لئے گاڑی کے اندر جگہ بنانے لگے۔ میں نے بھی اپنے اس نوجوان رشتہ دار کو جو اپنا گھر بار چھوڑ کر پیسے کمانے کے لئے باہر جا رہا تھا ٹرین پر سوار کیا اور خدا حافظ کہہ کر گھر کی طرف لوٹ آیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ شاید آج کوئی کہانی لکھ سکوں۔ لیکن۔ حضرات! مجھ کو معاف فرمائیں کہ وہ آخری کہانی جو میں لکھنا چاہتا ہوں آج بھی نہیں لکھ سکا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔!!

پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆

انا للہ

یوم آزادی کی پہلی کرن کا استقبال کرنے جب میں اپنے مکان کی سب سے اوپری چھت پر چڑھا تو میری نظر شہر کی اس سب سے بڑی سڑک پر جا پڑی جو شہر کے درمیان سے گذرتی ہے۔ جس نے شہر کے دو کناروں کو ہی نہیں ملایا ہے بلکہ ملک کی دو سرحدوں کے درمیان بھی رابطہ کی کڑی کا کام انجام دے رہی ہے۔ یوم آزادی کی پہلی کرن پھوٹنے سے پہلے ہی سڑک پر لوگوں کی ایک زبردست بھیڑ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

خوشی اس بات کی تھی کہ یوم آزادی کے سورج کی پہلی کرن کا استقبال کرنے والا میں پہلا آدمی نہیں ہوں بلکہ میری طرح انگنت لوگ اس سورج کے طلوع کا منظر دیکھنے کی تمنا لئے منہ اندھیرے اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

اس احساس سے مجھے تھوڑی شرمندگی بھی ہوئی کہ وہ لوگ جو تعداد میں کثیر ہیں مجھ سے کئی گونہ بہتر ہیں کہ ان لوگوں۔ نے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا ہے اور خوشی کے ان لمحات میں اپنے پورے شہر والوں کے ساتھ شریک ہیں جب کہ میں اپنی چھت پر تنہا کھڑا ہوں۔ میرے مکان کے دروازے اور کھڑکیاں بھی ابھی تک بند ہیں۔ حالانکہ خوشی کے ان لمحات کو اپنے در و بام کے ایک ایک ذرہ میں مجھے قید کر لینا چاہئے تھا۔

ابھی فکر کا یہ پیرہن تیار ہو ہی رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کا یہ اژدہام سڑک کی ایک سمت سے دوسری سمت بڑھ رہا ہے۔ اس طرف جہاں ملک کی سرحد نزدیک سے نزدیک تر ہو جاتی ہے۔

یہ دیکھ کر میرے ذہن میں پھر ایک نشان سوال ابھرا۔ آخر یہ لوگ ایک جلوس کی شکل میں ایک خاص سمت میں کیوں چلے جا رہے ہیں۔؟

پھر خیال آیا۔ شاید یہ لوگ ملک کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر نئے سورج کا استقبال کرنے والے ہیں یا پھر سمندر کے ساحل پر پہنچ کر اس اگتے سورج کا دلفریب منظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بیشک ان لوگوں کا یہ فیصلہ بہت صحیح ہے۔ انہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہ دن اسی کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس کا بھرپور طور پر پرجوش انداز میں استقبال کیا جائے اور خوشی کی ان ساعتوں کو طویل المیعاد بنا کر ذہن ودل کے گوشوں میں محفوظ کرلیا جائے۔ یہ سوچ کر مجھ کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں بھی کتنا کم طلب ہوں اتنی گراں قدر ساعتوں کی قدر کرنی بھی نہیں جانتا۔

ضمیر کے اس دوسرے جھٹکا کو میں برداشت نہیں کرسکا۔ فوراً اپنی چھت سے اترا۔ بیگم سے کہا۔ گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دو تاکہ یومِ آزادی کی پہلی کرن گھر کے ہر ہر گوشہ کو روشن کردے اور ابتلا و آزمائش کی سیاہی کو دھکے مار کر نکال دے۔ میں باہر جارہاہوں۔

یہ کہتا ہوا میں باہر نکل گیا اور لپک کر اس بڑی سڑک پر پہنچ گیا جو ملک کی ایک سرحد سے دوسری سرحد کو ملاتی ہے۔ بھیڑ میں مزید کئی گونا اضافہ ہو گیا تھا۔

سارے کے سارے لوگ آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہے تھے جدھر ملک کا سب سے بڑا میدان تھا۔ میں بھی کبھی آہستہ اور کبھی تیز ان لوگوں کے شانہ بہ شانہ اور کبھی ان کی بھیڑ کو چیرتا پھاڑتا اس میدان کی جانب بڑھنے لگا جہاں ساری خلقت کو جمع ہونا تھا۔

سورج نکلنے کا وقت جیسے جیسے قریب ہوتا چلا جارہا تھا لوگوں کی بھیڑ بڑھتی چلی جارہی تھی اور قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ استقبال میں اٹھنے والے ان تیز قدموں کو دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان کا احساس ہوا۔ یقیناً یوم آزادی کا یہی تقاضہ ہے کہ سست رفتاری کو ختم کردیا جائے۔ میں نے بھی اپنا قدم تیز۔ اور تیز تر کردیا یہاں تک کہ ہم لوگ اس میدان میں پہونچ گئے جہاں بہت سے لوگ پہلے سے جمع ہو چکے تھے اور بہتوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ وہاں ملک کی فوجیں بھی تھیں، سپاہی بھی تھے، اساتذہ بھی تھے، طلبہ بھی تھے۔ تجار بھی تھے، صنعتکار بھی تھے، افسران بھی تھے اور سیاست داں بھی تھے۔ یعنی عوام الناس بھی

تھے اور خواص بھی تھے۔ میری نظر گھوم گھوم کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی کہ یکا یک ایک دھماکہ ہوا۔ پھر کئی دھماکے ہوئے۔ شادیانے بجنے لگے، تالیوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ لارڈ اسپیکر پر طرح طرح کی دھن بجائے جانے لگے۔ نعرۂ مسرت بلند ہونے لگا۔ ہر چہرہ خوشیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ میرے کانوں میں یہ مدھر آواز آنے لگی۔ ع

اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے

وجود کی رگ وپے میں یہ آواز جادو جگانے لگی اور مسرت میں ہر شخص تھرکنے لگا۔ اب ہمارے اس آزاد وطن میں کوئی گلشن اجاڑا نہ جائے گا۔ بیشک نہیں اجاڑا جائے گا۔ کبھی نہیں اجاڑا جائے گا۔ ہرگز نہیں اجاڑا جائے گا۔

شادیانوں، تالیوں، لاؤڈ اسپیکروں اور نعرہ ہائے مسرت کی گہما گہمی میں میں نے دیکھا میدان کے ٹھیک بیچ میں ایک بہت بڑا پرچم لہرا رہا ہے جس سے رنگ برنگ کے پھول جھڑ رہے ہیں اور فضا میں اڑ اڑ کر رنگ برنگے موسموں کا پتہ دے رہے ہیں۔ دل نے کہا بیشک یہ وقت رنگ برنگے پھولوں کی یکجائی کا ہے انہیں فضاؤں میں لہرانے کا ہے۔ ان کی خوشبوؤں کے پھیلانے کا ہے۔ انہیں اپنے اپنے دامنوں میں سمیٹ لینے کا ہے۔ اور تب تقریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہمارے ہم وطنو! آج کا دن ہماری دیرینہ آرزو کی تکمیل کا دن ہے۔ ہمارے سامنے بہت سارے مسائل ہیں۔ جس طرح ہم لوگوں نے متحد ہو کر اپنی آزادی کی لڑائی لڑی اور اس دولت کو حاصل کیا ہے اسی طرح آہستہ آہستہ ہم اپنے سارے مسائل حل کرلیں گے۔ اب یہاں کسی بھی قسم کے بھید بھاؤ کی گنجائش نہیں۔ اس وطن کا چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ یکساں ہے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں۔ ہمارے دشمنوں نے ہمارے یہاں جو پھوٹ ڈالی تھی آج وہ پھوٹ اپنی موت آپ مرگئی۔ اب اگر کہیں کسی بھی وجہ سے کوئی فرق نظر آتا ہے تو ہم آج پکا ارادہ کریں کہ اس فرق کو مٹا کر دم لیں گے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ۔ ع

گلہائے رنگا رنگ ہے زینت چمن

دل نے کہا۔ بیشک۔ لاریب۔ بہت خوب۔ بہت خوب۔

ان گلہائے رنگارنگ کی رنگینیوں کا نظارہ کرنے میں ہماری نگاہیں محو تھیں اور

رقص وسرور کی محفلیں اپنے شباب پر تھیں کہ یوم آزادی کا سورج نصف النہار پر پہنچ گیا۔اور تب۔ میں نے دیکھا کہ شہ نشیں پر بیٹھے ہوئے لوگ نیچے اترے اوران میں سے چار افراد جن کی صورتیں دور سے پہچانی نہ جاسکیں البتہ جن کے لباس کچھ اس طرح تھے۔ایک نے دھوتی کرتا پہن رکھا تھااور دوسرے کی پیشانی پر قشقہ کھینچا ہوا تھا۔ یہ دونوں افراد آگے اترے۔ ان کے پیچھے آنے والے دو صاحبان میں سے ایک نے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی اور دوسرے کے بدن پر شیروانی اور پائجامہ تھا۔ چاروں نے جھک کر پرچم کے قریب سے کوئی چیز اٹھائی ۔تالیوں کی گڑگڑاہٹ ایک بار پھر سنائی پڑی۔ جب اس چیز کو اٹھا کر ان لوگوں نے اپنے اپنے کاندھوں پر رکھا تو میری نگاہیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔وہ ایک بڑا تابوت تھا جس میں تین لاشیں کفن میں لپٹی پڑی تھیں۔

یوم آزادی کی خوشیوں کی اس بیلا میں پرچم کے پاس رکھا ہوا تابوت پھر خوشیوں کے گیت، تالیوں کی گڑگڑاہٹ، دلوں میں مسرت کے کنول کھلانے والے نعرے اور خوبصورت تقاریر۔ یہ سب کیا تضاد ہے۔؟

میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور بہت دیر مبہوت کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ سورج مغرب کی جانب کافی جھک گیا اور میدان آدھا سے زیادہ خالی ہوگیا۔ جب میری محویت ختم ہوئی تو میں نے دیکھا تابوت کے پیچھے پیچھے یہاں جمع ہونے والے لوگ صف بستہ چل رہے ہیں۔ مضطرب دل نے پاؤں میں چکر باندھا اور میں تیزی سے اس طرف بڑھنے لگا جدھر سارے لوگ چلے جارہے تھے اور جن کے آگے آگے تابوت تھا۔ جس تابوت کو ان چاروں نے اپنے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ جن کے لباس کی جھلک میں نے دیکھی تھی۔

یقیناً یہ کسی ایسی عظیم شخصیت کا جنازہ ہے کہ جس کی قدر ملک کے تمام لوگ کیا کرتے تھے۔ اس لئے ہر نمائندہ شخص نے اس جنازہ کو اپنے کاندھے پر اٹھا رکھا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس جنازہ میں شریک ہیں۔ یقیناً وہ اتنی بڑی شخصیت کا جنازہ ہوگا کہ اسے یوم آزادی کی تقریب میں شامل کیا گیا اور اسے میدان کے بیچوں بیچ رکھ کر تمام لوگوں سے انہیں شردھانجلی دلائی گئی۔ بھرپورے اعزاز واکرام کے ساتھ انہیں لے جایا جارہا ہے اور

بہت سارے لوگ اس جنازہ کے جلوس میں شریک ہیں۔

پھر مجھے یہ خیال آیا کہ گذشتہ شب یقیناً ریڈیو پر مرحوم کی سوانح حیات بیان کی گئی ہوگی اور ان کے گراں قدر کارناموں سے سارے عوام کو روشناس کرایا گیا ہوگا۔ لیکن اب پچھتانے کا وقت بچا نہیں تھا۔ اب دیکھنا تو یہ تھا کہ آخر وہ شخص ہے کون۔؟

میں نے یکبارگی تیز تیز قدم اٹھانا اور بھیڑ کو چیر پھاڑ کر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے اس بات کا احساس شدت سے ستا رہا تھا کہ شام ہو چلی ہے۔ ساحل سمندر نزدیک تر ہوتا جا رہا ہے۔ جنازہ میں شامل لوگ ساحل سمندر پر پہنچ کر اس عظیم المرتبت شخصیت کا آخری کریا کرم کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ انہیں نذر آتش کیا جائے۔ نہ سپرد خاک۔ بلکہ حوالۂ موج بحر کر دیا جائے تاکہ کاندھا دینے والوں کے درمیان کسی بھی طرح کے اختلاف کی گنجائش نہ بچے۔ بھیڑ سے گذر کر جب میں آگے بڑھا اور جنازہ کے قریب پہنچا تو میں نے ملک کے تمام سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو دیکھا۔ جو کبھی اپنی ایر کنڈیشنڈ گاڑیوں سے سڑک پر نہیں اترے ہوں گے۔ وہ آج دھول بھری سڑک پر پیادہ پا چل رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر جنازہ کی عظمت میرے دل میں اور بڑھی۔ ان کے آگے میں نے گرو جنوں کو دیکھا جن کا کام گووند کی راہ بتانا ہے۔ پھر کچھ آگے میں نے دیکھا۔ ملک کے سارے گنے چنے لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں اہل ملک کے مذاہب کی لگام تھی۔ وہ عظیم شخصیات جن کے دروازوں پر عوام سجدہ ریزیاں کرتے ہیں اور جو بے تاج کے بادشاہ ہیں۔ اس طرح عوام کے ساتھ ساتھ اس جنازہ میں شریک انہیں دیکھ کر میرا دل عجیب طرح کی مسرت سے ہمکنار ہوا اور مجھے لگا کہ میں ایک خوش نصیب آدمی ہوں کہ اس جنازہ میں شرکت کا موقع آج مجھ کو بھی ملا ہے۔

اب جنازہ ساحل سمندر پر پہنچنے والا تھا اور میں مرحوم کی شخصیت کا علم حاصل کئے بغیر گھر لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ان عظیم ہستیوں سے آگے نکل پانا محال تھا جو جنازہ کے ٹھیک پیچھے تھیں۔ یہ بھیڑ ان لوگوں کی تھی جن کے گرد و پیش سنگین اور بھالے تھے۔ وردیاں اور ٹوپیاں تھیں۔ سفید پوشی میں وہ سب کے سب اپنی مثال آپ تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے

جو دھواں دھار تقریر کر کے عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے اور وہ بھی تھے جو ہمیشہ کرسیوں کی چھین جھپٹ میں مشغول رہا کرتے تھے اور اس بھیڑ میں وہ لوگ بھی کثیر تعداد میں اپنے اپنے جلوے دکھا رہے تھے جو مذکورہ افراد کے پاپوش اور اگالدان بن کر بھی اپنا سینہ فخر سے پھلائے رکھتے ہیں۔

میں کشمکش میں مبتلا تھا کہ کس طرح اس بھیڑ کو پار کروں اور مرحومین کی آخری زیارت کرلوں تا کہ ان کا نام و پتہ بھی معلوم ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر لوگ بکھرنے اور پھیلنے لگے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر لی۔ میں ٹھیک اس تابوت کے پیچھے پہنچ گیا۔

جیسے ہی تابوت پر جلی حروف میں لکھے ہوئے ناموں پر میری نظر پڑی میں چکرا گیا۔ گرنے ہی والا تھا کہ ایک شخص نے مجھ کو تھاما۔ اور کہا۔ ''اے کہانی کار۔ آپ یہاں کیوں چلے آئے۔؟ کیا آپ بھی اپنا قلم آج سمندر میں پھینک دینا چاہتے ہیں'۔؟؟ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس مہربان کو دیکھا جس نے مجھ کو سنبھال رکھا تھا۔ میری آنکھوں سے جھلکتے انکار کو دیکھ کر اس نے کہا۔ آپ کو تو میدان ہی سے لوٹ جانا چاہئے تھا۔ یہ سن کر میرے خطا ہوتے ہوئے اوسان واپس آئے۔ الٹے پاؤں دیوانہ وار میں اپنے گھر کی جانب دوڑا۔ سورج کے غروب ہوتے ہی تالیوں کی زبردست گڑگڑاہٹ فضا میں بلند ہوئی جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا کہ جنازہ غرق آب کر دیا گیا۔

میں سرپٹ گھر کی طرف بھاگتا چلا آ رہا تھا۔ سڑک مکمل طور پر ویران ہو چکی تھی۔ میدان کے، چاروں جانب کی آبادیوں سے انسانی گوشت کے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ ہر طرف دم گھٹنے والا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ پوری کی پوری انسانی آبادی پر سناٹا طاری تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کی آواز۔ ع

اب کوئی گلشن نہ اجڑے اب وطن آزاد ہے

فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ میں اپنے گھر کی جانب بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ دوسرے دن کا سورج اب نکلنے والا تھا۔ مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ نہ جانے میرا گھر بچا یا وہ بھی دھواں

بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ میدان کے گردو پیش کا بدلا ہوا منظر دیکھ کر میں طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔

یہاں تک کہ یومِ آزادی کے دوسرے دن کا سورج طلوع ہو گیا۔ اس سورج کا پورا وجود خون میں لت پت تھا اور وہ مکمل طور پر سرخ نظر آرہا تھا۔ اس سرخ فضا میں مجھ کو اپنا گھر نظر آیا۔ میں اپنے دروازہ پر پہنچ گیا اور اسے بے تحاشہ پیٹنے لگا۔ دروازہ کی زوردار پٹائی سے میری بیوی نے گھبرائی ہوئی کیفیت کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ اس کی پریشان حالی کا سبب پوچھے بغیر میں بھاگ کر اپنے کمرہ میں گھس گیا۔ میری سانس بہت تیز تیز چل رہی تھی۔ میری سراسیمگی دیکھ کر گھر والوں کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ میرے سارے بچے آکر مجھ سے چمٹ گئے۔ سب کے سب سوالیہ نشان بن گئے۔ آخرش بیوی کی زبان کھلی۔ ''کیا خدانخواستہ آپ کو بھی کسی نے گھیر لیا تھا''۔؟

''یہ آزادی ہمیں کیسی ملی۔''؟

''کیا آزادی کا سکھ ہمارے حصہ میں نہیں آیا''۔؟

یہ اور اس طرح کے کئی سوالات لگاتار مجھ سے پوچھے جارہے تھے اور میں مبہوت سا کھڑا سب کو دیکھ رہا تھا۔

بیوی نے مجھ کو اس طرح کھڑا دیکھ کر زور سے جھنجھوڑا۔ ''آپ کچھ بول کیوں نہیں رہے ہیں۔؟ کیا خدانخواستہ.........''؟

اور تب۔!

میں نے گھر والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''سنا آپ نے وہ جنازہ کس کا تھا''؟۔

''کون جنازہ''۔!

''ارے وہی۔ جسے کل تمام باشندگان ملک نے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا''۔؟

''ہاں۔ ہم لوگوں نے بس اس قدر سنا تھا کہ جشن کے میدان میں ایک جنازہ بھی تھا۔ اور اس جنازہ کے جلوس میں پورے ملک کے لوگ یکساں طور پر شریک تھے''۔ ''ہاں! بیشک وہ سارے لوگ اس جلوس میں شریک تھے جو اوپر والے ہیں''

''صرف اوپر والے''۔؟

''ہاں! تو اور کیا۔ صرف اوپر والے''۔ میں نے زور دے کر کہا۔

''کیا اس میں عوام نہیں تھے''۔؟

''بیچارے عوام کا کیا۔ وہ تو اوپر والوں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ ان کی شرکت اور عدم شرکت برابر ہے''۔!

''صحیح کہا، آپ نے۔! تو آخر وہ جنازہ کس کا تھا''۔؟ گھر والوں نے بیک زبان پھر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ مت پوچھو! اس سے تم لوگوں کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ میں تو بس یہی سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارا ملک کیسے چلے گا''۔؟

گھر والوں نے بیک زبان کہا۔ ''ہم سب لوگ آپ کے ساتھ وہ صدمہ برداشت کرلیں گے''۔!

میں نے کہا۔ ''تو لو! سنو''۔!

''وہ جنازہ ایک نہیں تین تھا''۔

''تین تھا''۔؟ ''ہاں تین تھا''۔

''وہ تین کون تھے؟ جلد بتایئے''۔؟ ''سنو''۔!

''وہ جنازہ تھا۔ انسانیت کا''۔!

''شرافت کا''۔!!

اور ایمانداری کا''۔!!!

اور تب سب کی زبان سے نکلا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**

پٹنہ و دربھنگہ ریڈیو سے نشر

☆☆

حَیَّ عَلَی الفَلاحُ

عائشہ اگرچہ آج نسبتاً سویرے ہی اپنے بستر پر دراز ہوگئی تھی۔ لیکن آدھی رات دھیرے دھیرے کھسک کر اس کے پاس سے دور ہو چکی تھی اور اس کی نیند کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ہائے۔ آج اسے کیا ہوگیا ہے۔؟ اس کی نیند کہاں چلی گئی؟ یہ رات آنکھوں میں کیوں کٹ رہی ہے۔؟

اس کے بچے اس کے گرد و پیش گہری نیند میں تھے۔ اس کے سرتاج بھی کروٹیں بدل بدل کر نیند کی دلہن سے ہم آغوش تھے۔ ایک وہ تھی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سو سکی تھی۔ وہ تصور کی دنیا میں کھوئی اپنی بچھڑی ہوئی سہیلی سے سوال کر رہی تھی۔ جوؔلی آج پندرہ بیس برس کے بعد تم میری زندگی میں ایک بار پھر کیوں داخل ہوگئی۔؟

جوؔلی تمہارا یہ کیسا آنا ہوا۔؟ یہ تو میرے لئے قطعی غیر متوقع اور انتہائی حیرت انگیز ہے۔ جوؔلی۔ تمہاری یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں اکثر اپنی تنہائی میں تم سے گفتگو کرتی تھی۔ تمہاری باتیں اور خاص کر وہ گرما گرم باتیں جب ہم دونوں کے درمیان بحث کا سلسلہ چھڑ جاتا تھا۔ تم اپنے موقف پر اٹل رہتی اور میں اپنے نظریات سے لمحہ بھر کے لئے بھی الگ ہونے کو تیار نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں انہیں ہمیشہ یاد کرتی رہتی تھی۔ ان باتوں کو یاد کرنے سے میری طالبعلمی کا زمانہ میرے پاس واپس آجایا کرتا تھا۔

جوؔلی مجھ کو وہ سب کچھ یاد تھا۔ اب بھی مجھے یاد ہے۔ پھر اس یاد کو تازہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟۔ جوؔلی! کیا برسوں کی رفاقت اور محبت کا صلہ تمہارے پاس اسی شکل میں تھا کہ تم مجھ کو فکرمندی کے گہرے غار میں ڈھکیل دو۔؟ اور میری نیند اڑا لے جاؤ۔؟

لیکن نہیں۔ جوؔلی! تم نے مجھ کو کسی غار میں ڈھکیلا نہیں ہے بلکہ غم کی جس گہری

ندی میں تم غوطے کھا رہی ہو اسی میں تم نے مجھ کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لیا ہے۔!

یقیناً اب میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔ اور تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتی۔ اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ وقت کا گھوڑا لگام توڑ کر ہم لوگوں کے ہاتھوں سے کوسوں دور بھاگ چکا ہے۔ اب یہ گھوڑا کبھی ہمارے قبضہ میں نہیں آئے گا۔ جولی تم اپنے موقف کی بھینٹ چڑھ چکی ہو۔ اب اگر تم میرے نظریہ کو قبول کرلینا بھی چاہو تو نہیں کرسکتی کہ وقت ہمیشہ ٹھہرا نہیں رہ سکتا۔ یہ کبھی کسی کے لئے نہیں ٹھہرا ہے تو پھر ہمارے اور تمہارے لئے کیسے ٹھہر سکتا تھا۔؟

جولی آج ساری رات میں تمہیں یاد کروں گی۔

جولی پورے بیس برسوں بعد آج تم مجھ کو ملی تھی۔

پھر بچھڑ گئی۔ پھر کب ملوگی۔ میں تو نہیں جانتی۔

شاید تم کو معلوم ہو۔؟ میں نہیں جانتی اس لئے میں آج ہی کی رات کو بھرپور طور پر استعمال کرنا چاہتی ہوں۔

دراصل عائشہ اور جولی دونوں اسکول کی ساتھی تھیں۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد دونوں نے کالج میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ پھر بی۔ اے تک دونوں ایک جان دو قالب بن کر رہی تھیں۔ عام طور پر ان کی سہیلیاں کبھی طنزاً، کبھی مزاحاً اور کبھی عقیدتاً دونوں کی دوستی پر طرح طرح کی ریمارکس پاس کیا کرتی تھیں۔

ارے بھائی یہ تو دو ہنسوں کا جوڑا ہے۔

ہاں، ہاں! ہے تو۔ لیکن ایک دن یہ لوگ اپنی اپنی دنیا میں پہنچ کر اس کا دوسرا مصرع گائیں گی۔

دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رے۔

واہ۔ واہ۔ کہئے کہئے۔ یہ گنگا جمنا کی جوڑی کدھر چلی۔

ارے۔ دیکھو۔ یہ الہ آباد جارہی ہوگی۔ سنگم۔ سنگم۔

اور کوئی کہتی۔ دیکھنا جی دیکھنا یہ شیخ و برہمن کی جوڑی۔ سچ سچ بھی تو ہمارے وطن کا

کمال ہے۔

عائشہ اور جولی دونوں ان باتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی اپنی دنیا میں مگن رہتیں۔ جب تک یہ کالج میں رہتیں ایک دوسرے سے لمحہ بھر کے لئے بھی جدا ہونا انہیں گوارہ نہ تھا۔

ایک وہ دن تھا۔ انہیں دنوں کی بات ہے۔ کہ جب عائشہ اور جولی شیر وشکر ہونے کے باوجود اپنی اپنی خصلتوں اور خصوصیتوں سے کسی بھی طرح خود کو الگ نہیں کرسکتیں۔ شیر شیر رہی تو شکر شکر۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بھی نظریۂ حیات کے مرحلہ اور مسئلہ میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا جدا بلکہ متضاد تھیں۔

یہ فکری تضاد انہیں بار بار گرما گرم بحثوں میں الجھا دیتا۔ کبھی کبھی تو بس یہ محسوس ہوتا کہ آج کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنا پسند نہیں کریں گی۔ لیکن برسوں کی رفاقت میں ایسا منحوس وقت کبھی نہیں آیا کہ ان دونوں نے خود کو ایک دوسرے سے جدا کر لینے کی بات سوچی ہو۔

دونوں کا خیال یہ تھا کہ جب خدا نے ہر انسان کو سوچنے اور عمل کرنے کی آزادی دے رکھی ہے تو اس کا غلط استعمال کیوں کیا جائے۔؟ جس طرح آزادانہ طور پر سوچنے اور عمل کرنے کا اختیار کسی ایک کو حاصل ہے اسی طرح دوسرے کو بھی حاصل ہے۔ اس لئے ہمیں اپنی فکر، نظریۂ حیات اور اصولِ زندگی کی صداقت اور اہمیت کے اظہار کا حق تو حاصل ہے لیکن اسے کسی پر بہ جبر تھوپنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ایسا تو خود خدا نے بھی نہیں کیا۔ جب کہ اسے ایسا کرنے کا اختیار کلّی حاصل تھا۔ اس نے تو کہا ہے کہ اگر میں چاہتا تو ساری دنیا کے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنا دیتا۔ جس طرح شجر وحجر، ارض وسماء، شمس وقمر اور انجم وملائک ہیں۔ لیکن میں نے انسانوں کو عقل وشعور دے کر آزادئ فکر وعمل دے دی ہے۔

جولی اور عائشہ دونوں کی نظر میں یہ بات تھی۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے سے اپنی فکر کی بنیاد پر بحث کیا کرتی تھیں لیکن اس گرم گفتاری کی وجہ سے کبھی ایک دوسرے سے ناراض، بددل اور برگشتہ نہیں ہوئی تھیں۔

ان میں سے ایک کا خیال یہ تھا کہ یہ عورت اور مرد گاڑی کے چکّے ہیں۔ زندگی کی گاڑی دونوں چکّوں کے برابری سے چلنے کا نام ہے اس لئے زندگی کے تمام محاذوں پر دونوں کو برابر کا شریک رہنا چاہیئے۔

عائشہ ان تمام باتوں سے اتفاق کرتی ہوئی ایک لیکن سے اپنی گفتگو شروع کرتی۔

لیکن جو آپی ہمیں منشائے الٰہی کو بھی تو نظر میں رکھنا چاہیئے۔

منشائے الٰہی سے تمہاری کیا مراد ہے۔؟

میری مراد یہ ہے کہ خدا نے مرد و اور عورت کو ایک دوسرے کا سہیم و شریک تو بنایا ہے لیکن زندگی کی گوناں گوں ضروریات میں دونوں کا دائرہ کار الگ الگ رکھا ہے

الگ الگ سے تمہاری مراد کیا ہے۔؟

الگ الگ کا مطلب یہ ہے کہ ہر گھر کی کچھ داخلی ضروریات ہوتی ہیں اور کچھ خارجی۔

کھانا پینا داخلی ضرورت ہے اور اس کا انتظام کرنا خارجی۔

واہ، واہ یہ اچھی تفریق تم نے رکھی ہے۔

لو! اس کے لئے ذرا اپنی عقل کو سوچنے کا موقع تو دو۔

سوچنے کا موقع کیا خاک دوں۔؟ تمہیں سوچو کہ کھانا مرد بھی کھاتا ہے اور عورت بھی۔ پھر کھانے کا سارا انتظام اکیلا مرد کیوں کرے۔؟ عورت بھی کیوں نہ اس کی شریک بنے۔؟

ہاں اگر عورت کھانے کا انتظام کرنے میں مرد کا ہاتھ بٹائے تو پھر مرد کو بھی چولہا چکّی کی آدھی ذمہ داری سنبھالنی چاہیئے۔

نہیں، نہیں یہ تو عورت کا خاص کام ہے۔

ارے واہ۔ کھانا کا انتظام کرے دونوں مل کر اور کھانا پکائے اکیلی عورت۔؟

یعنی عورت پر دوہرا بوجھ پڑے اور مرد کی ذمہ داری آدھی رہ جائے۔ خوب بہت خوب یہ ہے عورت کی آزادی کا تصور۔ یہ ہے عورت کے ساتھ رحم کا برتاؤ۔؟

عائشہ تمہاری فکر بالکل دقیانوسی ہے۔ اچھا۔ بائے۔ بائے۔ کل ملاقات ہوگی۔

میری فکر دقیانوسی ہے۔ ہونہہ۔ اپنے کو بڑی اپٹوڈیٹ سمجھتی ہیں۔ اچھا کل بتاؤں گی۔ بڑبڑاتی ہوئی عائشہ بھی رکشہ پر سوار ہو کر اپنے گھر روانہ ہو جاتی۔ کالج کی ہمہ ہمی سے نکل کر گھر کے پرسکون ماحول میں چلی آئی۔ البتہ اس وقت بھی اس کا دماغ فکر مند رہتا۔ جولی میری دوست ہے لیکن جدید فکر نے اس کی نظر کو کس طرح اندھا بنا رکھا ہے۔ افسوس کہ میں آج اس کو قائل نہیں کر سکی۔

دونوں کے دل میں ایک جیسا جذبہ ہمیشہ بیدار رہتا۔ جولی یہ محسوس کرتی کہ عائشہ کی دقیانوسیت اسے لے ڈوبے گی وہ لکیر کی فقیر بن کر زندگی گذارتی رہے گی اور عورتوں کی آزادی کی تحریک کا منہ چڑھاتی رہے گی اور ادھر عائشہ کو اس بات کا صدمہ ہوتا کہ جولی اس کی دوست ہے۔ آزادی نسواں کے نام پر جس طرز زندگی کی جانب کشاں کشاں بڑھتی چلی جارہی ہے اس سے عورتوں کو سکھ کی بجائے دکھ مل رہا ہے۔ لیکن اسے اس کا احساس نہیں۔ اپنی اپنی فکر کی دنیا میں کھوئی ہوئی یہ دونوں سہیلیاں موقع کی تلاش میں رہتیں۔

’’دیکھو عائشہ عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دینا، اس کو تعلیم سے محروم کر دینا، اسے بیٹھ کر مردوں کی کمائی کھانے والی بنا دینا، اگر دقیانوسیت نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔؟ تم کو میری بات بُری لگی ہوگی۔ میں نے تم کو اس دن دقیانوسی کہہ دیا تھا۔ معاف کروگی۔ جولی کی گفتگو میں لجاجت اور پشیمانی تھی۔

عائشہ کے لئے موقع غنیمت تھا۔ اس نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور اس نے کہا کہ کبھی کبھی کسی اچھی بات کو بُرے ڈھنگ سے بار بار دوہرا کر اسے برا ثابت کر دیا جاتا ہے۔ تم جانتی ہو ہٹلر نے کہا تھا۔ جھوٹ کو اتنا دوہراؤ کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔

تو کیا میں کسی جھوٹ کو تمہارے سامنے دوہرایا کرتی ہوں۔؟

نہیں جولی ناراض نہ ہو۔ تم نہیں دوہراتی بلکہ دوہرائی گئی بات نے تم کو غلط فہمی کا شکار کر دیا ہے۔

کون سی دوہرائی گئی بات۔؟

یہی کہ عورت کو چہار دیواری کے اندر۔ اسے تعلیم سے محروم کر دیا گیا ہے۔

معیشت کے معاملہ میں اس کو مردوں کا دست نگر بنا دیا گیا ہے۔

تو کیا۔! یہ سب غلط ہے۔؟

ہاں۔! یہ سب غلط ہے۔! عورت کو اپنے گھر کی ملکہ۔ اپنی اولادوں کی محافظ۔ معلم اور مربیّ۔ اپنے شوہر کے دل کی حکمراں بنا کر پوری دنیا کی آزادی عطا کر دی گئی ہے۔ جب کہ گھر سے باہر نکلنے کے بعد۔ ان سبھوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ تم شام کے وقت ملازمتوں سے گھر کی طرف واپس آتی ہوئی خواتین کا چہرہ ذرا غور سے دیکھا کرو۔ تھکی تھکی آنکھیں۔ مضمحل چہرہ، گرد میں اٹی ہوئی پیشانی اور چہروں پر بکھرے ہوئے بے ترتیب بال۔ یہ عورت اپنے گھر میں داخل ہو کر شوہر کے لئے، بچوں کے لئے، دوسرے اہلِ خانہ کے لئے محبت، شفقت اور رحمت کیسے بن سکتی ہے۔؟ یہی عورت جب صبح کے وقت اپنے گھروں سے نکلتی ہے تو دلہن کی طرح سجی ہوئی ہوتی ہے اور جب شام لوٹتی ہے تو بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا جوبن وقت کے ظالم ہاتھوں نے لوٹ لیا۔ بتاؤ جوآپی اس کا گھر میں رہنا اس کے لئے اچھا تھا یا گھر سے باہر نکل کر مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرنا۔؟

عائشہ یہ بھی تو سوچو کہ گرانی کے اس دور میں ایک مرد کی کمائی پر گھر کیسے چل سکتا ہے۔؟

ہاں جوآپی! یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس پر بھی گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا آج ہماری ضروریات میں بہت ساری غیر ضروری چیزیں داخل نہیں ہو گئی ہیں۔ پھر ہم ضروری اور غیر ضروری چیزوں سے اپنا گھر تو بھر لیں لیکن زندگی کی سچی خوشیاں ہم سے چھن جائیں تو یہ سودا نفع کا ہے یا گھاٹے کا۔؟ ہمارا شوہر ہم سے مشینی تعلق رکھے۔ ہمارے بچے بورڈنگ کی زندگی گذاریں اور ہماری محبت سے محروم ہو جائیں، ہمارا گھر ایک ہوٹل یا سرائے میں بدل جائے۔

عائشہ یہ باتیں، بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دل میں اترنے والی نہیں ہیں۔

تو قصور دل کا بھی ہو سکتا ہے۔؟

تم جو کہو! لیکن میرا تو پکا ارادہ یہی ہے کہ میں اپنی پسند سے اپنا رفیق حیات منتخب کروں گی۔ اور زندگی کے ہر میدان میں اس کی مددگار بن کر کھڑی رہوں گی۔

تو کیا تمہارے والدین تمہیں اس کی آزادی دے دیں گے۔؟

ہاں! کیوں نہیں۔ میں پہلے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤں گی۔ پھر اپنی راہ پر چل نکلوں گی۔ اگر وہ لوگ اس راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوں گے تو میں انہیں بھی ٹھوکر مار کر آگے نکل جاؤں گی۔

شاباش جوؔلی۔ شاباش۔ یہ ہے آزادئ نسواں کی معراج۔ مرد بھی یہی چاہتے ہیں کہ عورت اپنے سارے بندھنوں سے آزاد ہو جائے اور اپنی خواہشات کے بندھن میں بندھ جائے۔ اور تم جانتی ہو کہ خواہش اندھی ہوتی ہے۔ راہبر اندھا ہو تو راہی کا انجام کیا ہوگا۔ یہ تم خود سوچو۔!

جوؔلی اور عائشہؔ کی یہ آخری گفتگو تھی۔ دونوں بی۔ اے کا فارم بھر چکی تھیں اور ایک دوسرے کو گڈبائی کہنے والی تھیں۔ دونوں کو اس کا شدید احساس تھا کہ آج کے بعد نہ جانے زندگی کے کس موڑ پر کہاں اور کیسے ملاقات ہو۔ اس لئے وہ دونوں یہ نہیں چاہ رہی تھیں کہ آج کی گفتگو کسی تلخ موڑ پر ختم ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے مستقبل پر فیصلہ چھوڑ دیا اور خدا حافظ کہہ کر امتحان تک کے لئے رخصت ہو گئیں۔

پھر امتحان کا وقت آیا۔ مرکز امتحان پر دونوں ایک دوسرے سے ملتی رہیں اور امتحان کے موضوع پر دونوں کی گفتگو ہوتی رہی۔ سکون اور اطمینان رخصت ہو چکا تھا۔ زندگی کا دوسرا رنگ سامنے آچکا تھا، جہاں صرف ہلچل، اضطراب اور بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔

پھر اس کے بعد دونوں کو ایک دوسرے کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں کی دونوں بی۔ اے کا امتحان پاس کر گئیں۔

اور آج اس کے برسوں بعد یکایک دوا کی ایک دکان پر عائشہؔ اور جوؔلی آمنے سامنے ہو گئیں۔ عائشہؔ حسب معمول چہرہ پر حجاب ڈالے کچھ دوائیں خرید رہی تھی اور جوؔلی

ہاتھ میں ایک بڑا بیگ اٹھائے دکاندار سے اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ میں مس جوآلی۔! آپ کے علاقہ میں کیڈیلا کمپنی کی نمائندہ۔ کیا حال ہے ہماری کمپنی کی دواؤں کا۔؟ کیا ڈاکٹروں کے پرزے آپ کے یہاں آرہے ہیں۔؟

عائشہ ٹکٹکی باندھے جوآلی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ مس جوآلی اس کی عزیز ترین سہیلی جوآلی ہے۔ یقین بھی کیسے آئے۔ عائشہ کی بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایم۔ اے سال اول کی طالبہ تھی۔ اس کا بڑا بیٹا میڈیکل سکنڈایر کا طالب علم تھا۔ بقیہ بچے بھی مختلف اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم تھے۔ اور جوآلی اب تک مس جوآلی کی مس جوآلی ہے۔ پھر جوآلی کا نہ وہ نرم و نازک چہرہ ہے نہ اس کی باتوں میں لچک ہے۔ نہ اس کی آواز میں سریلا پن ہے۔ اب تو وہ ایک موٹی بھدی سی عورت ہے۔ جس نے خود کو جینس سوٹ میں چھپا کر دل آویز بنانے کی ناکام سی کوشش کی ہے۔ لیکن بیک نظر اسے کوئی بھی شخص مس تسلیم نہیں کر سکتا۔

عائشہ نے سوچا۔ نہیں یہ وہ جوآلی نہیں ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے بل ادا کیا اور دکان سے اتر گئی۔ اس کی آواز سن کر جوآلی نے اسے پیچھے سے پکارا۔ عائشہ۔!

عائشہ کا قدم رک گیا۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا اور غیر اختیاری طور پر پوچھا۔

جوآلی۔ میری جوآلی۔!!

ہاں عائشہ۔ تمہاری جوآلی۔!

ایک لمحہ تک دونوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملائیں اور تب ایک دوسرے کے گلے سے بے اختیار لپٹ کر سسکنے لگیں۔

ماضی اچھل کر سامنے آ گیا۔

دونوں نے ایک دوسرے سے ایک ہی جیسا سوال پوچھنا شروع کیا۔

تم کیسی ہو۔؟

تم کیسی ہو۔؟

یہاں کب آئی۔؟

یہاں کب آئی۔؟

جو لی نے کہا میں ہوٹل میں ایک کمرہ لے کر ٹھہری ہوئی ہوں۔ چلو وہاں چل کر ایک ایک کپ چائے پی لیں۔

دونوں نے یکجا ہو کر ایک دوسرے کو اپنی روداد سنائی۔

امتحان پاس کرتے ہی میری شادی ہو گئی۔ میرے شوہر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ تاجر ہیں۔ میری پسند کی زندگی مجھ کو مل گئی۔ میں بہت خوش ہوں۔ میرا گھر بچوں سے بھرا پُرا ہے۔ سب کے سب زیر تعلیم ہیں۔ بڑی بچی کی شادی ہو چکی ہے۔ میرے شوہر مجھ سے بہت خوش رہا کرتے ہیں۔ میں ان کے لئے وقف ہوں اور وہ میرے لئے۔ عائشہ ایک ہی سانس میں اپنی پوری روداد زندگی سنا گئی۔ اور ادھر جو لی کی زبان سے پہلا لفظ ہی نکلا تھا کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گیا۔

عائشہ حیران تھی۔ جو لی۔ کیا ہوا۔؟

عائشہ میری کہانی اس کے برخلاف ہے۔ میں نے جب بی۔ اے پاس کیا تو فوراً ایک دفتر میں نوکری مل گئی۔ والدین نے میری شادی کرنی چاہی۔ میں نے اس سے پہلے مل لینے کی شرط لگا دی۔ اسی دوران میں میرے آفس کا ایک نوجوان میرے قریب آیا۔ مجھ کو اس سے قربت محسوس ہوئی۔ میں نے اپنا سب کچھ اس کے حوالہ کر دیا۔ یہی سوچ کر کہ شادی تو محض ایک رسم ہے۔ کسی بھی وقت یہ رسم ادا کی جا سکتی ہے۔ برسوں تعلق کا یہ ڈرامہ چلتا رہا اور میں لٹتی رہی۔ اس احساس کے بغیر کہ میں لوٹی جا رہی ہوں۔ یکا یک ہوائی اڈہ پر اس نے مجھ کو ٹاٹا کہا۔ میں سمجھی وہ آنے کا وعدہ کر رہا ہے اور اس نے ہاتھ لہرا کر جو کہا تھا وہ کبھی نہ آنے کی بات تھی۔

میرے اندر کی آزاد عورت نے مجھ کو للکارا۔ تو نہیں اور سہی۔ اور نہیں اور سہی۔ اس طرح اس جذبہ کے زیر اثر میں مستقل سایہ کی تلاش میں مختلف شاخوں میں جھولتی پھرتی یہاں تک کہ پورے پندرہ برس اس میں گذر گئے۔ پھر مجھ کو یہ احساس ہوا کہ اب میرے لئے کوئی سایہ نہیں بچا۔ ہر پیڑ مجھ کو دیکھ کر اپنی شاخیں سمیٹ لیتا ہے اور خزاں کی طرح زرد رو ہو جاتا

ہے۔تب میں نے آخری فیصلہ کرلیا۔پچھلے پانچ برسوں سے ایم۔آر بن کر شہر شہر کے چکر لگاتی ہوں۔ہوٹلوں میں ٹھہرتی ہوں۔کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا میرے پاس چلا آتا ہے تو میں اس کی بھوک مٹا دیتی ہوں۔لیکن اپنی بھوک اور اپنا دکھ دونوں اپنے سینے میں چھپائے رکھتی ہوں۔اتنا کہہ کر جوآلی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔عائشہ نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور رخصت ہوکر اپنے گھر آ گئی۔

کل جوآلی اس کے گھر آئے گی۔؟

کیا وہ اس سچائی کا سامنا کرسکے گی۔؟ جو میری دقیانوسیت کی دبیز چادر تلے مسکرایا کرتی تھی۔اس وقت جب جوآلی مجھ کو دقیانوسی کہتی تھی۔؟

کیا جوآلی اکیلی لڑکی ہے جو ''آزادی'' کی چتا کا ایندھن بنی ہے۔؟نہیں۔نہیں۔!

جوآلی تم اکیلی نہیں ہو۔آدھی نسل انسانی اس جہنم میں کود چکی ہے۔ذات، فرقہ، نسل، علاقہ اور مذہب کا کوئی بندھن بھی اسے اس جہنم میں جانے سے نہیں روک سکا ہے لیکن اب بھی اسے ہوش نہیں آیا ہے۔!

جوآلی اب یہ سوچو کہ جو آدھی نسل انسانی بچی ہے اسے کیسے بچایا جائے۔؟

یہی سوچو۔!

میں بھی آج کی رات یہی سوچ رہی ہوں۔!

تم بھی اب سے صرف یہی سوچو۔!جوآلی۔میری جوآلی۔

عائشہ بڑبڑا رہی تھی اور موٴذن کی رس بھری آواز اس کے کانوں میں شہد گھول رہی تھی۔

حی علی الفلاح۔!

حی علیٰ الفلاح۔!!

پٹنہ۔دربھنگہ ریڈیو سے نشر

☆☆

دوسری آزادی

کہا جاتا ہے کہ مردوں کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے اور اس کہاوت کی تائید میں ساری دنیا کے لوگ دنیا بھر کے واقعات سنایا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بات قصۂ آدم اور تخلیق جہاں تک جا پہنچتی ہے۔ واقعات اتنے زیادہ ہیں اور روایات اس قدر کثرت سے بیان کی گئی ہیں کہ اب اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں کہ عورت مرد کی کمزوری ہے یا اس کی مجبوری۔ جو کچھ ہے۔ وہ ہے اور بہر حال ہے۔ اس کے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ دنیا کی تین بڑی زبانوں نے اس کے لئے تین بڑے خوبصورت اور با معنی الفاظ تراش رکھے ہیں۔

انگریزوں نے اسے Better half کہا ہے حالانکہ اردو کے ایک شاعر نے یہ کہہ کر اس لفظ کا حلیہ بگاڑ دیا ؎

میری قسمت دیکھئے میں جب سے شوہر ہو گیا
نصف بہتر وہ ہوئیں، میں نصف بدتر ہو گیا

جس دن سے ریاض بلیاوی کا یہ شعر میری سماعت سے ٹکرایا ہے اسی دن سے یہ میرے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا ہے اور مسلسل طور پر مجھ کو اس کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ اس کا شدید ردِ عمل مجھ پر یہ ہوا ہے کہ مجھ کو انگریزی الفاظ سے چڑھ سی ہو گئی ہے۔ ''نصف بہتر'' زبان پر آیا نہیں کہ اپنے ''نصف بدتر'' ہونے کا احساس جاگنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاید ہی کوئی عورت ایسی ہوگی جو بیوی بن جانے کے بعد اپنے شوہر سے یہ کہتی نہ سنی گئی ہوگی کہ '' آپ کسی کام کے نہیں ہیں۔ آپ سے بہتر تو فلاں کے میاں ہیں۔'' شوہر کسی بھی اعلیٰ معیار کا ہو سب کو اس دلنشیں جملہ کی سوغات ملتی رہتی ہے۔ کسی لکھنوی شاعر

نے شاید اسی جذبہ کے تحت یہ کہا ہے۔

جو نہ ڈرے ترکوں کی فوج سے
وہ بھی ڈرے بیوی کی نوج سے

یہ بھی شاید انگریزوں کے ''نصف بہتر'' کا نتیجہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ لیکن لاحول بھیجنے سے کیا ہوتا ہے؟ انگریز تو کب کے گئے مگر انگریزی تو پہلے سے زیادہ ہمارے سروں پر حکمراں ہے یعنی حکمراں کا تو انتقال ہو گیا لیکن اس کا بھوت ہمیں ہلدی بلا رہا ہے۔ اور یہ بھوت اصل حکمراں سے بھی زیادہ جابر ہے۔

انگریزی سے جیسے ہی میں نے منہ موڑا تو دیکھا کہ دوسرے کونہ سے ہندی کی ''اردھانگنی'' جھانک رہی ہے۔ گھونگھٹ سے اس کے جلوے دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ ایک مرد کی شادی کیا ہوئی؟ اس کا پورا انگ دو انگوں میں بنٹ گیا۔ یا یہ کہئے کہ اس کا آدھا انگ گروی ہو گیا۔ اللہ نے اسے بھرا پُرا بنایا اور اس کا جوڑا لگنے کے چکر نے اسے آدھا کر دیا۔ شاید اسی لئے ہندی پردیش والے شادی سے پہلے اپنے جسم کی پوری قیمت وصول کر لیتے ہیں تب جا کر کسی کو اردھانگنی بنانا پسند کرتے ہیں۔

دیکھا آپ نے؟ بظاہر الفاظ بے جان معلوم ہوتے ہیں لیکن کس قدر توانائی ان میں بھری ہوئی ہے۔ ایک ایک لفظ کہانی ہی نہیں ایک دنیا اپنے اندر چھپائے رکھتا ہے۔ یہ دنیا اسے کنوئیں میں جھنکاتی ہے۔ پٹخہ بھی مارتی ہے اور جنت کی سیر بھی کراتی ہے۔ غور فرمایئے بیچارے ہندی پردیش کے لوگ اردھانگنی کو قبول کرنے سے پہلے آدھی زندگی کی قیمت وصول نہ کرلیں تو کیا کریں؟

یاں خوب سودا نقد ہے
اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

یعنی اگر کسی کو پورے جسم کو آدھا بنانا ہے تو اس آدھے جسم کی پوری قیمت دے دو۔ اس کے لئے تمہارا پورا خاندان بھیک مانگنے لگے تو مانگا کرے۔ بک جائے تو بکا کرے۔ توبہ ہی بھلی۔ یہ دماغ بھی کیا چیز ہے۔ اللہ نے اسے کھوپڑی میں چھپا کر سارے

جسم پر مسلط کر دیا اور یہ اپنے اقتدار کا استعمال کر کے جسم کو جہاں تہاں لئے پھرتا ہے۔ کبھی پر خار وادی میں، کبھی اونچے پربتوں پر اور کبھی ہواؤں کے اڑن کھٹولے پر۔

اسی طرح اڑتا اڑتا جب میں اپنے گھر۔ یعنی بستر پر لوٹا تو دیکھا کہ میری شریک زیست ساتھ کی پلنگ پر لحاف میں پڑی ہیں ان کے ساتھ ان کی نواسی بھی ہے اور ان سے پوچھ رہی ہے۔

''ہاں ننا! تو پھر کیا ہوا''۔؟

نواسی کا یہ سوال سن کر میں بھی متوجہ ہو گیا کہ آخر وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔؟

یعنی نواسی کا سوال کیا ہے؟

اور نانی کا جواب کیا ہے؟

نواسی نے پھر پوچھا۔ ''ننا بولئے نا''۔؟

''بلّی کے گلے میں گھنٹی کس نے باندھی''۔؟

تو اس کا یہ سوال سن کر مجھ کو وہ کہانی یاد آ گئی جو مجھ کو میرے بچپن میں میری دادی نے سنائی تھی۔ میں سوچنے لگا واقعی یہ اہم مسئلہ ہے۔ جب میں چھوٹا تھا اس وقت میرے سامنے یہ سوال تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔؟

قصہ کچھ اس طرح ہے کہ اس وقت ہمارا ملک آزاد ہوا تھا۔ اس کے بہت پہلے سے چوہوں کا بے دریغ قتل ہو رہا تھا سارا خون بلی کی گردن پر تھا۔ اس وقت بھی چوہوں کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھی جائے لیکن یہ مشکل حل نہیں ہو پا رہی تھی کہ گھنٹی کون باندھے۔؟

اب جبکہ میں نانا بن چکا ہوں میری نواسی میری بیوی سے یہی سوال دوہرا رہی ہے کہ ''ننا آخر کیا ہوا؟ بلّی کے گلے میں گھنٹی کس نے باندھی''۔؟

یعنی چوہوں کے قتل عام کا سلسلہ اب بھی نہیں رکا ہے اور بلّی کے گلے میں اب تک گھنٹی نہیں باندھی جا سکی ہے لیکن مجھے اب بھی یاد ہے کہ میری دادی نے اپنی دادی سے یہ کہانی سنی تھی اور ان کی دادی نے بھی اپنی دادی سے یہ کہانی سنی تھی یعنی چوہوں کے قتل کا یہ

قصہ سینکڑوں نہیں ہزاروں برس پرانا ہے۔

میں اسی فکر میں غلطاں تھا کہ میری بیگم نے کہانی پھر سے شروع کر دی۔

تو سنو!

ہاں سنائیے!

لیکن ایک شرط کہ آج تم سوؤ گی نہیں۔!

نہیں۔نہیں سوؤں گی۔!

وعدہ۔!

ہاں وعدہ۔!!

لو سنو کئی ہزار برس پہلے کی بات ہے۔ایک بہت بڑے ملک میں بہت بھاری تعداد میں بہت سارے لوگ رہتے تھے۔ملک بہت بڑا تھا۔وہاں کی زمین بہت زرخیز تھی۔ طرح طرح کے غلّے پھل اور سبزیاں وہاں پیدا ہوتی تھیں۔زیادہ تر لوگ جنگلوں میں رہتے تھے۔دور دراز علاقوں میں کچھ کچھ اچھی آبادیاں تھیں۔ وہاں کے لوگ زیادہ خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔پڑھے لکھے بھی تھے اور خوش خوش زندگی گذارنے کا سلیقہ بھی انہیں حاصل تھا۔وہ لوگ جو جنگلوں میں رہتے تھے ان کی بھی زندگی کا اپنا رخ تھا۔کھانا پینا اور اپنے ڈھنگ سے گذر بسر کرنا ان کا مشغلہ تھا۔وہ لوگ جنگل سے شہر کی طرف کبھی نہیں آتے کہ انہیں شہر والوں سے ڈر لگتا تھا۔ان کی چمک دمک کو وہ للچائی نظروں سے دیکھتے تھے۔ان کے قریب آنا چاہتے تھے لیکن شہر والوں کو اپنے شہری ہونے کا غرور تھا۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ علم حاصل کرنا صرف انہیں کا حق ہے اور دنیا کی دولت پر قبضہ جمائے رکھنا بھی انہیں کا حصہ ہے۔ایک طرح کی دیوار تھی جو جنگل والوں اور شہر والوں کے درمیان کھڑی تھی۔نہ شہر والے اپنی دیوار ہٹا سکتے تھے اور نہ جنگل والے اس دیوار کو پھلانگ سکتے تھے۔

شہر والوں کا حال یہ تھا کہ اگر جنگل والوں کے ہاتھ میں کوئی خوشنما پھل یا کوئی جانور دیکھ لیتے تو جھپٹ کر ان سے چھین لیتے اور کبھی موقع ملتا تو ان جانوروں کے ساتھ ان کو بھی پکڑ لیتے اور اپنے گھر لا کر انہیں جانوروں کے ساتھ رکھتے۔ان سے اپنے گھر کا سارا

کام لیتے۔ چھوٹا سے چھوٹا اور بھاری سے بھاری کام وہ انجام دیتا لیکن کبھی اسے شہر والے کی طرف سے برابری کا لقمہ نصیب نہیں ہوتا۔ یہیں سے یہ جنگل والے جنگلی چوہا بن گئے اور شہر والے بلّی بن گئے۔

وقت گذرتا گیا۔ بلیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان کی خواہشات بڑھتی گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے جنگل کے باہری حصوں پر قبضہ جمانے لگیں اور چوہے اندر سے اندر گھنے سے گھنے جنگل میں گھستے چلے گئے۔ اس ملک کا شہری حصہ دن بہ دن زیادہ سے زیادہ پھیلتا چلا گیا۔ زرخیز ہوتا چلا گیا۔ اور زمین سونا اگلنے لگی۔ سونا اگلنے کی یہ خبر دھیرے دھیرے پاس پڑوس کے ملکوں تک پھیل گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑوسی ملک کی اور زیادہ خوبصورت، مضبوط اور حوصلہ مند بلیاں اس ملک کے شہری علاقوں میں داخل ہو گئیں۔

''واہ۔ واہ نتا۔ اور بلیاں آ گئیں۔؟''

ہاں۔ ہاں۔ اور بلیاں آ گئیں۔!

پھر تو نئی پرانی بلیوں میں خوب جھگڑا ہوا ہوگا۔؟

ہاں بیٹا۔! تم دیکھتی ہو نا جب ایک بلی کے گھر میں دوسری بلی آ جاتی ہے تو دونوں خوب ایک دوسرے پر غراتی ہیں۔ طرح طرح کی ڈراؤنی آواز نکالتی ہیں۔

ہاں نتا جان! رات کو بلی کی آواز سن کر میں ڈر جاتی ہوں۔

تم ڈر جاتی ہو۔؟

ہاں ڈر جاتی ہوں۔!

لیکن۔ ڈر تو کمزوری کی پہچان ہوتی ہے۔

تم چھوٹی ہو نا۔ اس لئے ڈر جاتی ہو۔

تو کیا ڈرنا نہیں چاہئے۔؟

نہیں کبھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ ہمیشہ ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس دنیا میں سب سے بڑا اللہ ہے۔

ہاں۔ یہ تو میں جانتی ہوں۔

پھر یہ سمجھ لو کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا ہے اور جس کے دل میں اللہ کا ڈر نہیں ہوتا وہ دنیا میں ہر چیز سے ڈرتا ہے یہاں تک کہ بلی کی آواز سے بھی ڈر جاتا ہے۔

سمجھ گئی۔؟

جی سمجھ گئی۔!

اب تو نہیں ڈرو گی۔؟

نہیں۔نہیں ڈروں گی۔!

اچھا تو پھر کیا ہوا۔؟

ہاں۔!تو پہلے نئ اور پرانی بلیوں کے درمیان خوب جھگڑا ہوا۔ان کے غرانے کی آواز جب جنگل کے چوہوں تک پہنچی تو وہ سب چوہے اور سہم گئے۔اور سہم کر جنگل کے گھنگھور اندھیروں میں جا چھپے۔نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جنگل کا باہری حصہ بالکل خالی ہو گیا جسے پرانی بلیوں نے اپنا مسکن بنا لیا۔

اب نئ اور پرانی بلیاں نئے انداز سے پورے شہری علاقہ میں رہنے لگیں اور موقع بہ موقع جنگلی چوہوں کا شکار کر کے انہیں حراساں کرتی رہیں۔یہاں تک کہ ایک مدت گذر گئی۔

جنگلی چوہوں کی تعداد بھی آہستہ آہستہ کافی بڑھ گئی۔پھر انہیں بھی جینے کا سلیقہ آ گیا۔وہ لوگ بھی جنگلوں کو کاٹ کاٹ کر شہر بسانے لگے۔یہاں تک کہ اس ملک میں پہاڑ دل ور جنگلوں کے درمیان چوہوں کا شہر بس گیا اور موٹی موٹی دیواروں کے درمیان بلیوں کا شہر اپنی چمک دکھانے لگا۔

تب تو بلیوں نے چوہوں کو کھانا بند کر دیا ہوگا۔؟

نہیں بیٹا!یہی تو سمجھنے کی بات ہے۔

کیا سمجھنے کی بات ہے۔؟

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بلیوں کے اندر اپنے بڑپّن کا اور اپنی طاقت کا غرور تھا

جبکہ چوہوں کو یہ احساس تھا کہ وہ کمزور ہیں۔ وہ بلّیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہ بلّیوں نے جھپٹنا چھوڑا اور نہ چوہوں نے ڈرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کبھی موقع ملا بلّیاں چوہوں کے شہر پر چڑھ دوڑیں اور ان کی پرسکون سلطنت کو پامال کرنے لگیں۔

پامالی کے دراز ہوتے اس سلسلے نے جب کشت وخون کا بازار گرم کیا تو اس ملک کے آسمان پر کرگسوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔

کرگسوں کو دیکھ کر ان کے ساتھ اور بھی بہت سارے پرندے آ گئے۔ ان پرندوں میں کچھ پرندے ایسے بھی تھے جو پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنے لگے۔ جب سڑی لاشوں اور بہتے ہوئے خون کی سرانڈ کم ہوئی تو دھیرے دھیرے یہ پرندے پہاڑوں سے اتر کر پورے ملک میں پھیل گئے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ سینکڑوں اور ہزاروں بلیوں اور چوہوں کے درمیان یہ اکا دکا پرندے رہنے بسنے لگے۔ انہوں نے ان کے درمیان رہ کر انہیں محبت اور شجاعت کا سبق سکھایا۔

چوہے جو ہمیشہ سے کمتری کے احساس میں مبتلا تھے اس سبق پر متوجہ ہوئے اور دل کھول کر اس پرندے کی نصیحت سننے لگے۔

برابری، بھائی چارہ، ہمدردی، عزت نفس اور اتحاد باہمی چوہوں کا یہ نیا سبق اور اب یہی ان کا وظیفہ بن گیا۔

وقت گذرتا گیا اور پرندے کی نصیحت اپنا کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ چوہوں نے بالکل نئی مورچہ بندی کر لی۔ اپنا شہر چھوڑ کر وہ مکمل طور پر بلیوں کے شہر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے بلیوں کے تمام شہروں کی زمین میں سرنگ بنا لیا اور ہر جگہ اپنی چوکیاں بنا لیں تب بلیوں کو بھی اس کا احساس ہو گیا۔ وہ وقتاً فوقتاً زور زور سے غرّانے لگیں۔ کبھی کبھی وہ جھپٹتی بھی ہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ کسی چوہے پر جھپٹتی ہیں کوئی دوسرا چوہا ان کی پشت پر دوڑتا ہے اور ان کی ٹانگ پکڑ کر اپنے بلوں میں گھسیٹ کر لے جاتا ہے جہاں اس چوکی پر تعینات سبھی چوہے جشن منا منا کر اپنے اوپر کئے گئے ہزاروں برس کے ظلم کا بدلہ ان سے چکاتے ہیں۔

اب بلیاں جس زمین پر کھڑی ہیں ان کی نچلی سطح پر چوہوں کا مکمل قبضہ ہو چکا

ہے۔ان کی تمام بلند عمارتیں اب ہوا میں ڈول رہی ہیں۔ بلیاں بوکھلائی ہوئی ہیں۔

بلیوں کی یہ بوکھلاہٹ دیکھ کر چوہے، سینہ تان کر پورے شہر میں چلنے پھرنے لگے ہیں۔ وقت اور زمانہ سب بدل گیا ہے۔اب بلیوں کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔اب تو سبھی چوہے شیر بن چکے ہیں۔

شیر۔؟

ہاں بیٹا۔! شیر بن گئے ہیں۔شیر۔!

اب وہ عزت کی زندگی گذار رہے ہیں۔اور ان پرندوں کو دعائیں دے رہے ہیں جنہوں نے ان کو شجاعت اور محبت کا سبق سکھایا تھا۔

اور پرندوں نے بھی انہیں اپنا دوست بنالیا ہے کہ دونوں ہی کے دل میں عزت کی زندگی جینے کی تمنا ہے۔

پٹنہ ریڈیو سے نشر

ہائے رے انسان کی مجبوریاں

تقریباً دو جگ بیت گئے اور اس طرح بزرگوں کی یہ دعا کہ ''جگ جگ جیو میرے لعل'' کی قبولیت کا میں زندہ ثبوت ہوں۔ کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ہی سہی۔ یعنی میں اپنے بزرگوں کے لئے لعل ثابت نہ ہوسکا البتہ جگ جگ جی کر دعا کی تاثیر کی مثال بن گیا۔ آتی جاتی سانسوں نے کئی جگ دیکھ لئے البتہ جس دو جگ پہلے کو میں آج یاد کرنے بیٹھا ہوں وہ دراصل ایک عجیب سی دلخراش اور دل شکن یاد ہے جسے میں چاہ کر بھی آج تک بھلا نہ سکا۔

شاید یہ واقعہ آج آپ کو سنا کر میں اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا کرسکوں۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اگر آپ کا دل بھی حساس ہوا تو پھر کہیں برسہا برس تک یہ دکھ آپ کی راحت میں خلل انداز نہ بن جائے۔ حالانکہ یہ قطعی ضروری نہیں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان گنت واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی آپ کے لئے غیر اہم اور بے اثر ثابت ہو۔

معاف کیجئے گا۔ مجھ کو یہ کہنے کے لئے کہ آپ پر اہم واقعہ اور غیر اہم واقعہ سب یکساں اثر ڈالتا ہے یعنی ایک دھچکا لگا۔ پھر گاڑی آگے بڑھی۔ پھر دھچکا لگا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو افلاس اور ادبار کا تنگ ہوتا ہوا دائرہ کب کا ٹوٹ چکا ہوتا۔ جہالت کے اندھیرے سے آپ کی نسل بہت پہلے نکل چکی ہوتی۔ ذلت وخواری کی زندگی کی چادر اب تک تار تار ہو چکی ہوتی لیکن جو حال پچاس سال پہلے تھا اس سے کئی گنا زیادہ بدحالی کا منظر آج آپ کے گھروں میں اپنا مسکن بنائے کھڑا ہے۔ یہ خرمستی کب آپ کا ساتھ چھوڑے گی کبھی یہ سوچا کیجئے۔ خوب سوچا کیجئے۔ جب یہ سوچ پختہ ہو جائے تب کچھ کیا کیجئے۔ جان لیجئے کہ کچھ کئے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ کشکول گدائی لئے در بہ در مارے مارے پھرنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جایئے۔ لیکن یاد رکھئے یہ احساس اس وقت

جاگے گا جب ہر واقعہ پر آپ کی نظر گہری ہوگی۔ بھاگتی ٹرین میں بیٹھے مسافر کی طرح بھاگتے منظر کو دیکھ کر جی خوش کر لینے سے کام نہیں چلے گا۔

لیکن ٹھہریئے اور سنئے کہ ایک واقعہ جو میرے دل پر آج بھی اتنے ہی گہرے اثرات دکھا رہا ہے۔ جتنی شدت سے یہ اس وقت مجھ کو محسوس ہوا تھا ذرا سوچئے کہ یہ واقعہ کیسا تھا۔؟

یاد رکھئے! کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سب سچ ہے۔ پہلی سچائی تو یہ ہے کہ یہ واقعہ تقریباً دو جگ پہلے کا ہے جب میں اپنی ملازمتی زندگی میں نیا نیا ہی داخل ہوا تھا شاید اس کے پانچ برس ہی پورے ہوئے ہوں گے۔ اب جبکہ میں نہ ٹھیک سے پڑھا سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔ پڑھا اس لئے نہیں سکتا ہوں کہ اب پڑھنے والوں کا کال ہے اور پڑھ نہیں سکتا ہوں اس لئے کہ اب پڑھنے کے لائق چیزیں کم دستیاب ہیں۔ نہ افسانہ، نہ شاعری، نہ مقالہ، نہ مضمون، جو کچھ ہے سب ہلکا پن کا شکار ہے۔ جب لکھنے والے مغز سے خالی ہو چکے تو تحریر کہاں سے پُر مغز ہوگی۔؟ چبائے نوالے کو چبانا ہی اب فخر کی بات ہے۔ بوڑھے لوگ اب بھی گداز بازوؤں کو ہاتھ میں لینے کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ غزل گو آج بھی چشم میگوں سے شراب ناب کی چسکیاں لینا چاہتے ہیں۔ معاشی مساوات کا تصور ریزہ ریزہ بن کر بکھر چکا ہے اور ہر روز ہواؤں میں اس کی چتاؤں کی دھجیاں اڑتی نظر آ رہی ہیں لیکن اب بھی وہی راگ الاپا جا رہا ہے۔ ترقی پسندی کے بیلون کی ہوا نکل چکی ہے مگر اب بھی وہی کالر سیدھی کرنے کی دھن سوار ہے۔ ساری سیاسی قطب بندی بکھر بکھر کر ملیامیٹ ہو چکی ہے۔ کمزوروں اور پسماندوں کی نئی کھیپ تیار ہو چکی ہے۔ ایک نظریہ زندگی جو عالم انسانیت کے لئے امن کا ضامن اور رحمت کی عملی علامت تھا۔ چو طرفہ یورش کا شکار ہے۔ دہشت پسندی، بنیاد پرستی اور قوم پرستی کا نیا فلسفہ اور اس فلسفہ کے نئے کردار وضع کیے جا رہے ہیں ایسے وقت میں کیا پڑھا جائے؟

اس کے برخلاف جب میں نے نوکری شروع کی تھی اس وقت ہم نے ملک کی آزادی کا جشن زریں تو کیا جشن سیمیں بھی نہیں منایا تھا۔ اس وقت دل میں یہ حوصلہ جوش مار

تا تھا کہ برسہا برس کتابوں کی ورق گردانی سے جو کچھ دماغ کے خزانہ میں جمع ہوا ہے اسے انڈیل کر اس نئی نسل کے دماغ میں ڈال دوں جن کے والدین نے ان کی تربیت کی نیت سے ہمارے پاس انہیں بھیج رکھا ہے۔ ہر وقت بس یہی فکر تھی اور یہی چکر تھا۔

جاڑے کی آمد آمد تھی صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ میں کالج کے لئے نکل چکا تھا اور اس چوک پر سے گذر رہا تھا جس سے میں ہر روز گذرتا تھا۔ یکا یک یہ دیکھا کہ ایک دراز قد سڈول بدن کا جوان لوگوں کی پھٹکار سن کر اس دکان کے صحن پر سے اٹھ کھڑا ہوا جس کا مالک اپنی دکان کھولنے پہنچ چکا تھا۔ وہ جوان کھڑا تو ہو گیا لیکن لمحہ بھر میں اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ایک آواز آئی ''سالے نے بھر پیٹ پی لیا ہے''۔ پینے والوں کا یہ تماشہ ہر روز نظر سے گذرتا رہتا ہے اس لئے میرے دل میں نفرت کا جذبہ بیدار ہوا۔ لیکن چند قدم چلنے کے بعد میں نے دیکھا وہ صحت مند جوان ایک دوسری دکان کے سامنے بچھے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا اور لمحہ بھر میں وہ اس پر لیٹ جانا چاہ رہا تھا کہ پھر شور برپا ہوا۔ ''اٹھو اٹھو۔ یہاں سے اٹھو۔ بھاگو یہاں سے''۔ اس جوان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں رحم کی درخواست تھی تب کسی نے کہا۔ ''لگتا ہے کسی نے اسے کچھ کھلا دیا ہے''۔ اس اظہار خیال کے باوجود بینچ کے مالک نے دھکا مار کر اس شخص کو بینچ سے زمین پر گرادیا۔

چوراہے پر چاروں طرف دکاندار کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے اور ہر شخص اس بات کے لئے تیار کھڑا تھا کہ اگر اس نے اس کی دکان کا رخ کیا تو وہ بھی اسے دھکے مار کر بھگا دے گا۔

یہ سارا منظر چوک سے گذرتے ہوئے میری نظر سے گذر گیا۔ مجھ کو یہ فکر لاحق تھی کہ نو بج کر دس منٹ سے آنرز کلاس شروع ہو جاتا ہے اور لڑکے میرے شعبہ کے باہر کھڑے میری راہ دیکھتے ہیں اس لئے میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا کالج روانہ ہو گیا۔

ہمارا کالج اس شہر کا اکلوتا ڈگری کالج ہے جہاں اس کے گرد و نواح کے دور دراز کے علاقوں کے طلباء اپنی علمی پیاس بجھانے آیا کرتے ہیں۔ ہم نوکری میں نئے نئے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ کئی شعبوں میں نئے نئے لوگوں کی بحالیاں ہوئی تھیں۔ ہم سبھوں کے

سر پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ ہمارے شعبہ کا ریزلٹ اچھا ہو۔ ہمارے لڑکے ہم سے زیادہ خوش ہوں۔ ہماری شہرت ایک ایماندار، محنتی اور صاحب علم استاد کی حیثیت سے ہو۔ ہمارے ساتھ معاملہ ان تمام دوستوں سے الگ بھی تھا۔ کالج کھلنے کے لگ بھگ آٹھ سال بعد ہمارا شعبہ کھلا تھا اور میں اس کالج کا تنہا مسلمان معلم تھا۔ میری تقرری کے کچھ ہی دن بعد چاروں طرف یہ بات پھیل گئی تھی۔ اس طرح میں سخت ترین امتحان میں مبتلا تھا۔ مجھے انگنت لوگوں کی آرزوؤں کے مطابق ہونا تھا اور انگنت لوگوں کے وقار کا میں ضامن تھا اس لئے اس وقت میں ان تمام ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کے لئے کوشاں تھا۔

میرے قدیم طلبا جن کے بچے اب میرے پاس پڑھنے آچکے ہیں جب یہ سنتے ہیں کہ میں اب ویسا نہیں ہوں جیسا کبھی تھا تو انہیں یقین نہیں آتا ہے کہ میرے استاد بھی ویسے نہیں ہو سکتے جیسی خبر ان کو مل رہی ہے مجھ کو بھی نہیں لگتا ہے کہ میں اتنا بُرا ہو چکا ہوں۔ البتہ مجھ کو اپنے والد صاحب کا یہ فقرہ اکثر یاد آتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے۔ ''مرغی جیسے جیسے بڑھتی ہے اس کا پَر سکڑتا جاتا ہے''۔ تو کیا میرے پَر بھی سکڑتے جا رہے ہیں؟ لیکن۔ نہیں۔ میں اپنے پَر کو کبھی نہیں سکڑنے دوں گا۔ کبھی نہیں۔ جس دن ایسا ہو جائے گا وہی دن میری موت کا دن ہوگا۔ پَر ہے تو پرواز ہے اور پرواز ہے تو زندگی ہے۔

مجھ کو نوکری کے وہ ابتدائی ماہ و سال خوب یاد ہیں۔ عام لوگ یہ کہا کرتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں کہ کالج کے اساتذہ کے پاس فرصت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ دن بھر میں دو تین کلاس۔ ہفتہ میں تین چار دن۔ سال بھر میں چار پانچ ماہ گن کر کالج چلے گئے۔ اللہ اللہ خیر صلیٰ۔ لیکن مجھ کو تو کبھی ایسا نہیں لگا۔ گھر پر پڑھنے سے فرصت نہیں کالج میں صبح سے شام تک مسلسل مختلف درجات میں پڑھانے سے فرصت نہیں۔ ایک تنہا ٹیچر اور مسلسل کلاس۔ اس روز بھی حسبِ معمول یہی ہوا۔ ساڑھے تین بجے جب میں تھکا تھکا اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو پھر اسی چوک پر ایک دوسرا منظر دیکھا۔

ایک لاش پڑی ہے جس کا پورا جسم سرخ رنگ کے کپڑا سے ڈھانک دیا گیا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر لگا ہے جس پر بھجن کا ریکارڈ بج رہا ہے اور بیچ بیچ میں مرحوم کے آخری کریہ کرم کے

لئے چندہ کی اپیل کی جارہی ہے۔ بازار کے لوگ روپیوں کی بارش کر رہے ہیں۔ پورے مذہبی جوش وخروش سے یہ کام انجام دیا جارہا ہے۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو وہی شخص جو صبح میں دھکے کھارہا تھا اس وقت مرا پڑا ہے اور لوگوں سے عقیدت کا خراج وصول کر رہا ہے۔

چوک پر جس جگہ لاش پڑی تھی وہاں بجلی کے دو کھمبے نصب تھے اور اس کے گرد و پیش پھل فروش اپنے ٹھیلے لگا لگا کر تازہ پھل بیچا کرتے تھے۔ وہ پھل فروش اس وقت بھی وہاں موجود تھے۔

میں نے ایک پھل فروش سے کنارے جاکر اس آدمی کے مرنے کی تفصیل جاننی چاہی تو اس نے بتایا کہ اس شخص کو کسی ظالم لٹیرے نے ٹرین میں کوئی زہریلی غذا کھلا دی تھی جس کی وجہ سے وہ بیہوش ہو گیا تھا۔ جنکشن پر قلیوں نے اسے ڈبہ سے نکال کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا تھا جہاں اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اسے کچھ ہوش سا آیا۔ اس نے چاروں طرف مسافروں کو آتا جاتا دیکھا۔ لیکن زبان سے کسی سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ کسی نے اس کی جانب توجہ بھی نہیں کی۔ شاید اس بیچارے کو یہ خیال آیا کہ پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگ ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر غیر مقامی ہوتے ہیں اس لئے مزاج پرسی کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب اس شخص کو مزید ہوش آیا تو پھر وہ شہر کی طرف چل پڑا کہ وہاں کے لوگ خالص مقامی ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں کچھ انسانی ہمدردی ہوتی ہوگی اور شاید وہ لوگ اس کی کچھ مدد کر سکیں گے۔ جب وہ شخص اس چوک پر آیا تو جس دکان کے سامنے ٹھہر کر اس نے لیٹنا چاہا اس دکان کے مالک نے اسے وہاں سے بھگا دیا۔ آخری بار وہ اس دکاندار کے بینچ پر جاکر لیٹا۔ اس دکاندار نے اس شخص کو پہلے تو بہت زور سے ڈانٹا پھر بھی وہ نہیں اٹھا تب اس نے اسے دھکہ مار کر بینچ سے نیچے گرا دیا۔ بینچ سے گرنے کے بعد وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا بجلی کے ان کھمبوں کے پاس آ گیا۔ اسے کافی دیر تک پکڑ کر کھڑا رہا پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگے اور وہ زمین پر گر گیا۔ زمین پر گرتے ہی اس کی روح پرواز کر گئی۔

میں نے اس پھل فروش سے پوچھا کہ اے اللہ کے بندے! یہ سارا تماشہ تمہاری نظروں کے سامنے ہوا اور تم نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی؟ تم تو مقامی آدمی ہو۔ میری

طرح کرایہ کے مکان میں رہ کر باہر کا آدمی نہیں کہلاتے ہو۔ یہاں پر تمہارے بہت سے بھائی بند بھی ہیں جو تمہارے ساتھ سارا دن پھل بیچتے رہتے ہیں۔؟

پھل فروش نے بتایا کہ ہم لوگ یہاں ٹھیک اس وقت پہنچے جب وہ شخص گر رہا تھا۔ ہم لوگوں نے دوڑ کر اسے سنبھالنا چاہا۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ سر اٹھا کر منہ میں پانی ڈالنا چاہا لیکن یہ سب اس وقت شروع ہوا جب اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس کے پہلے کا سارا واقعہ ہم لوگوں کو مقامی دکانداروں نے بتایا ہے۔ جب ہم لوگوں نے اس کے مردہ ہونے کا اعلان کر دیا تب اس کی تدفین کی فکر ہوئی۔ شناخت کے لئے جب اس کے انڈر ہینٹ میں جھانکا گیا تو معلوم ہوا کہ اس مرنے والے کو دفن نہیں کیا جاسکتا اور تب بقیہ دکانداروں کی رگ حمیت پھڑکی۔ ان کی رگوں میں غیرت کا خون جوش مارنے لگا۔ فوراً کپڑہ والے نے دو گز سرخ رنگ کا کپڑا لا کر اس کے جسم پر اوڑھا دیا۔ لاوڈ اسپیکر والے نے اپنا لاوڈ اسپیکر لا کر لگا دیا اور ٹیپ بجانا شروع کر دیا اور وہ شخص جو ٹیپ ریکارڈ روک روک کر عوام سے تعاون کی اپیل کر رہا ہے اسے تو آپ پہچان رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہاں جی! اسے مجھ سے زیادہ کون پہچانے گا۔؟ یہ وہی نوجوان ہے کہ جسے میں نے امتحان میں چوری کرنے کے الزام میں اکسپیل کر دیا تھا اور جو ہفتوں تک آتشیں اسلحہ لے کر مجھ کو ڈھونڈھتا پھرا تھا۔

اور کیا آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اسی شخص نے فلاں فلاں اشخاص کا قتل بھی کیا ہے۔؟

میں نے کہا۔ ہاں میں اچھی طرح یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ قاتل ہے اور اس سے بچنے کے لئے اب وہ مذہبی بن کر سماج میں اپنی امیج بنانے کی فکر میں لگا ہے۔ اسی سہارے وہ سیاست کی گلیوں میں بھی چلنے پھرنے لگا ہے اور اب اس کی گردن میں نیتا جی کی تختی لٹکتی نظر آرہی ہے۔

پھل فروش نے کہا کہ اب آپ ہی سوچئے کہ وہ شخص کھڑا ہو کر چندہ مانگے اور کس کی مجال ہے کہ کچھ دئے بغیر وہاں پر سے گذر جائے۔ صرف یہی نہیں ہے بلکہ لوگ ایک

سے ایک۔ آگے بڑھ کر۔ دکھا دکھا کر روپے برسا رہے ہیں۔

میں نے ایک نظر وہاں کے سارے منظر پر ڈالی اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا گھر پہنچا۔ خاموشی سے کھایا پیا اور خاموشی سے بستر پر گر پڑا۔ بیوی کو کچھ گمان گذرا۔ کچھ اندیشہ ہوا لیکن یہ سوچ کر کہ ایسا کچھ اس سے پہلے بھی ان کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور میں نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ یہ سوال ساری رات میرے ذہن کے سامنے رہا کہ ہماری یہ دنیا اب کیسی ہوگئی ہے۔؟

مذہبیت کیا ہے۔؟

سماجی کارکن کیسا ہوتا ہے۔؟

اب ہماری اس دنیا کا کیا ہوگا۔؟

ہم نے تو کسی نہ کسی طرح آدھی زندگی جی لی ہے۔ بقیہ آدھی بھی کسی نہ کسی طرح کھیپ لوں گا۔ ان بچوں کا کیا ہوگا۔؟ جو اس وقت ہمارے چاروں طرف آنکھیں کھول رہے ہیں۔

ہم انہیں کیسی دنیا حوالہ کرنے والے ہیں۔؟

کیا یہ لوگ بھی اسی طرح عیاری، مکاری، غنڈہ گردی اور دھوکہ دھڑی کی زندگی اختیار کرلیں گے۔؟

بچوں کی دنیا سے نکل کر اپنی فکر کی دنیا میں سمایا تو یہی بھیانک منظر نظر کے سامنے پھرنے لگا۔ ہم بھی سفر کرتے ہیں۔ یہاں۔ وہاں۔ دور دراز۔ یکا وتنہا۔ تو کیا اس انجام تک ہم نہیں پہنچ سکتے؟ کیا وہ لوگ سفر نہیں کرتے جنہوں نے اس بدنصیب مسافر کو دھکے مار مار کر موت کے گڑھے میں گرادیا۔؟

پھر میں نے اپنے ذہن کو ایک جھٹکا دیا۔ چھوڑ و یار۔ اپنی فکر کرو۔ دوسروں کے بارے میں سوچنا چھوڑو۔ لیکن اسی لمحہ اندر سے آواز آئی۔ دوسروں کے بارے میں نہیں سوچنے کا تو یہ نتیجہ ہے۔ پھر ہم کیوں نہیں دوسروں کے بارے میں خود بھی سوچیں اور اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی کہیں کہ اسی طرح سوچو بھائی۔! اسی طرح تم بھی سوچو۔ میں بھی سوچ

رہا ہوں اور تم بھی سوچو۔!

نہ جانے کب مجھ کو نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دوسری صبح نمودار ہو چکی تھی۔ طلباء کے چہرے سامنے تھے۔ نو بجے تک کالج پہنچ جانا تھا۔ اسی چوک سے پھر گذرنا تھا۔ میں نے خود کو بستر سے الگ کیا۔ تیار ہوا اور حسب معمول ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلا۔ چند قدم ہی گیا تھا کہ دیکھا۔ ایک زبردست جلوس آ رہا ہے۔ ناقوس پھونکا جا رہا ہے گھنٹہ بجایا جا رہا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر ''ہری نام'' بھجو۔ ہری نام بھجو'' ۔کی دھن بجائی جا رہی ہے۔ درمیان میں اسی مسافر کی بجی سجائی لاش ہے۔ آگے آگے وہی سماجی کارکن سینہ پھلائے۔ ہاتھ پھیلائے پوری شان سے چل رہا ہے۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر نیتا جی کو پرنام کر رہے ہیں اور اس اہم خدمت کے لئے ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ جلوس میں چوک پر کے سبھی دکاندار شامل ہیں۔

میں بھیڑ سے گذر کر اسی چوک پر آ گیا ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ وہی بدنصیب مسافر دھکے کھا رہا ہے۔ اسے ڈانٹ پلائی جا رہی ہے سارے لوگ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ پھل بیچنے والے اب تک وہاں نہیں پہنچے ہیں۔ اور سوچتا ہوں کاش پھل والا پہلے آ جائے!

کاش۔!

پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆

بانگِ رحیل

اور آخر کار آج یہ ہو ہی گیا۔ دس برسوں سے انتہائی نظم وضبط، سکون واطمینان سے گذرنے والی زندگی اس موڑ پر پہونچ گئی جہاں سے نیا باب اور نیا دور شروع ہونے کے تمام تر امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ اب تک کی پر سکون زندگی کا تمام تر سہرا اس کی بیوی کے سر پر تھا جو انگنت بار زہر میں بجھے ہوئے طنزیہ الفاظ کو تبسم کی شیرینی میں گھول گھول کر ذہن ودل میں اتارتی رہی اور تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچاتی رہی۔

بات بظاہر بہت چھوٹی سی تھی۔ جملوں میں بہت زیادہ نوکیلا پن بھی نہیں تھا پھر بھی ایک قسم کے جملوں کی تکرار نے آخرش اس کی بیوی کے ضبط وتحمل کے کوہِ گراں کو پاش پاش کر دیا۔

لیکن نہ جانے کس طرح آج وہ بھی اتنا سنجیدہ ہو گیا کہ اس کی بیوی کی ایک بات نے اس کے ذہن کے ہر تار کو مرتعش کر دیا۔ اس کا پورا وجود کرب کی جھنجھناہٹ سے بھر گیا۔ اس کی بیوی نے یہ جملہ اب تک کی زندگی میں پہلی بار اس کی فکر کی آغوش میں اچھال کر پھینکا تھا۔ ''جی ہاں! میری ماں نے سب سے بڑا جرم تو یہ کیا ہے کہ میری دیتیں۔ کاش انہوں نے ایسا کیا ہوتا''۔

بیوی کی یہ بات سن کر طاہر سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ پچھلے دس برسوں کے دوران میں مختلف موقعوں پر اس طرح کی کہی گئی باتیں بھی اس کے ذہن کے پردوں پر یکے بعد دیگرے انگڑائیاں لیتی ہوئی اس کے سامنے آتی چلی گئیں۔ دراصل اس کی عادت سی ہوگئی تھی کہ جب کسی کی شادی سے واپس آتا تو لڑکی کو ملنے والے جہیز کی طویل فہرست کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے کرتا۔ پھر یکایک خاموش ہو جاتا اور چہرے پر افسردگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ روشی کو یہ دیکھ کر صدمہ ہوتا لیکن وہ مسکرا مسکرا کر اپنے والد کے کئے کی سزا بھگت لیتی۔ پھر یہ ہوا کہ طاہر کی تنخواہ میں اضافہ اور روشی کی سلیقہ مندی وکفایت شعاری کی وجہ سے طاہر کی

جیب میں کچھ روپے بچنے لگے اور تب اس کی خوابیدہ آرزوئیں بیدار ہونے لگیں اور وہ خواہش وضرورت کی چیزیں خرید خرید کر لانے لگا۔ جب بھی بازار سے کوئی نیا سامان خرید کر لاتا تو چہکتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ روشی کو پکارتا اور اس کے ہاتھوں میں وہ نیا سامان دیتا ہوا کہتا۔ ''لو یہ ٹیپ ریکارڈ۔ تنہا گھر میں رہتی ہو کیسیٹ بجاتی رہنا۔ دل بہلاتی رہنا''۔ روشی کے ہونٹ پر مسکراہٹ آجاتی اور تب طاہر کا اگلا جملہ اس کے کانوں پر دھماکہ بن کر گر جاتا۔ ''کاش تمہارے ابو نے تمہاری ضرورت کا خیال رکھا ہوتا۔'' یہ سن کر روشی کو ایسا لگتا کہ جیسے ٹیپ ریکارڈ پر کھدے ہوئے سوراخ تاریکی کے گہرے سمندر ہیں جس میں اس کا وجود ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اپنی بھرپور طاقت اور اپنے جواں حوصلوں کے سہارے ڈوبتی ڈوبتی دوبارا ابھر جاتی۔ یکایک ذہن سے سب کچھ جھٹک دیتی اور بڑے پیارے انداز میں طاہر سے کہتی۔ ''اسے کس طرح ہینڈل کروں گی یہ تو بتا دیجئے''۔

طاہر کا شوق اپنی نامعلوم منزل کی جانب بڑھتا گیا ہر دو چار ماہ پر روشی کو کسی نہ کسی چیز کے بہانے اس طرح کے جملوں کا وار سہنا پڑتا تھا۔ وہ اکثر اپنی تنہائی میں یہ سوچتی کہ طاہر بھی کیسا آدمی ہے۔ نہ اس کی خواہش مختصر ہوتی ہے اور نہ اس کا انداز بدلتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی سوچتی کہ اس کے ابا جان نے اگر بطور جہیز یہ سب کچھ دے بھی دیا ہوتا تو کیا طاہر مطمئن ہو جاتا۔ یہ تو مردوں کی ہوس پسند فطرت ہے۔ جو کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایسی لڑکیوں کا انجام بھی ہے جو اپنے باپ کے گھر سے جہیز کے سامانوں سے لدی پھندی سسرال آئی تھیں لیکن انہیں سکون اس وقت حاصل ہوا جب انہوں نے اپنے گلے میں پھندے لگا لئے یا پھر دیا سلائی کی تیلی چولہے میں لگانے کی بجائے اپنے آنچل میں لگا بیٹھی۔

روشی اس موضوع پر جتنا زیادہ سوچتی اس کا ذہن الجھتا چلا جاتا۔ یہاں تک کہ اسے ان خیالات کو جھٹک دینے ہی میں عافیت نظر آتی۔ اکثر یہی ہوتا کہ روشی الجھنوں کو جھٹک کر سکون پا لیتی اور نئے تیر سہنے کے قابل خود کو بنا لیتی۔ اس اہتمام صبر کے باوجود آج وہ ضبط نہیں کر سکی جب طاہر نے روشی کے باپ کو ایک بار پھر مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرتے ہوئے یہ کہا کہ ''لو یہ ٹیلی ویژن بھی لا دیا۔ اگر یہ مل گیا ہوتا تو آج میرے تین ہزار روپے بچ

گئے ہوتے''۔ طاہر کے اس احساس محرومی کے اظہار نے آج روشی کے پیمانۂ صبر کو چھلکا دیا اور روشی نے آج اپنے باپ کے سب سے بڑے جرم کا خود اعتراف کر لیا۔

لیکن روشی کے اس اعتراف نے آج طاہر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ طاہر سوچنے لگا اس کی بھی کئی بیٹیاں ہیں وہ نہ تو اسمگلر ہے، نہ سود کی تجارت کرتا ہے اور نہ ہی رشوت خور ہے۔ وہ تو ایک سیدھا سادہ ایماندار سرکاری ملازم ہے جسے بندھی ٹکی تنخواہ ملتی ہے۔ تنخواہ کتنی ہی زیادہ ہو اس کا بندھا ٹکا ہونا ہی کیا کم ہے؟ کیا وہ اپنی اس تنخواہ سے اپنی بیٹیوں کے جہیز کے لئے وہ تمام سامان فراہم کر سکے گا جس کی آرزو اس کے دل میں تڑپتی رہتی ہے۔ اس کی شادی تو بہر حال دس برس پہلے ہوئی تھی۔ جب دس برس بعد اس کی بیٹی کی شادی ہوگی تب اس وقت کیا ہوگا؟ کیا اس کی بیٹی کو بھی یہی سوچنا پڑے گا کہ اس کے باپ نے اس کی پرورش کر کے ایک جرم کیا ہے؟ حالانکہ خالق ارض وسماوات نے بیٹی کی پرورش کرنے والے کو جنت کی بشارت دی ہے اور محبوب خداؐ نے ایسے لوگوں کو جنہوں نے بیٹیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے جنت میں اپنا ساتھی قرار دیا ہے۔

ذہن میں اس ہیبتناک تصور کے آتے ہی اس کا ذہن ہتھوڑے کی چوٹ سے چکنا چور ہونے لگا اور وہ اپنے اندر ہی اندر ٹوٹنے لگا۔ پگھلنے لگا، بکھرنے لگا۔

فکر کی اس تلخ دھوپ میں اسے امید کا ایک سایہ نظر آیا۔

وقتاً فوقتاً وضع ہونے والا قانون۔!

لیکن دوسرے ہی لمحہ عمل درآمد کے فقدان کے سبب ایسے قوانین کو کتابوں کے سرد اوراق میں ٹھٹھرا، سمٹا، بے بسی کے عالم میں پڑا ہوا دیکھ کر اسے مستقبل کی ہولناکی نظر آنے لگی۔

یہی وہ مرحلہ ہے کہ جس سے ناکام گذرنے پر انگنت زندگیوں کو آگ میں جھلسنا پڑا ہے۔ سولی پر چڑھنا پڑا ہے اور پانی میں کودنا پڑا ہے۔ اگر روشی نے اسی انداز میں سوچنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا۔ تو اگر کشتہ شدہ آہ چہ می کردم من۔ آہ میری جان تو اگر مر جائے گی تو میں کیا کروں گا۔؟

اور تب وہ اچانک روشی کے آگے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

روشی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

روشی میں اب تک اندھیرے میں بھٹک رہا تھا۔ میرے ذہن پر دنیا کی ہوس کا آسیب مسلط تھا۔ میں خود غرضی کے اندھے کنواں میں گر چکا تھا۔ روشی تم نے آج مجھ کو اس کنوئیں سے باہر نکال لیا ہے۔ روشی۔ میری روشی۔

مجھے معاف کر دو۔

میری پیاری روشی آؤ ہم دونوں مل کر سماج میں ذہنی انقلاب کا صور پھونک دیں تا کہ پھر کسی روشی کو اس کا اپنا باپ مجرم نظر نہ آئے۔

روشی ساکت وصامت کھڑی طاہر کو دیکھتی رہی۔ طاہر میں یہ تبدیلی دیکھ کر روشی فرط مسرت سے آبدیدہ ہو گئی۔ طاہر بولتا رہا۔

روشی سنتی رہی۔ اور تب دوڑ کر بیتابانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ طاہر کے گلے سے لپٹ گئی۔ روشی کے لپٹتے ہی طاہر کے وجود میں عزم وحوصلہ کا گرم خون دوڑنے لگا اور اس نے قلم ہاتھ میں پکڑ کر انقلاب کا اعلان کر دیا۔

اب کوئی گلشن نہ اجڑے۔

اب قلم آزاد ہے۔

☆☆

جاگتی آنکھوں کا خواب

آج پورے دو برس بعد۔ میں نے انہیں چند لمحہ کے لئے دیکھا۔ بالکل آمنے سامنے۔ چند لمحہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اسے افسانوی لمحہ نہ سمجھا جائے اور اس کے لئے میں صرف یہی کہہ سکوں گی کہ آپ یقین کیجئے وہ صرف ایک لمحہ تھا۔ فروری کی گلابی شام تھی۔ ایوننگ شو سے اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ فلم کے متعلق سوچتی ہوئی چلی آرہی تھی کہ ذہن میں اچانک ''ان کا'' تصور ابھر آیا۔ میں بھی کتنی پاگل ہوں اب بھی انہیں ''ان'' کہہ کر پکار رہی ہوں حالانکہ گذشتہ دو طویل برسوں میں میں نے انہیں بھول جانے کے لئے طرح طرح کا انداز اختیار کیا ہے۔ میں نے انہیں کبھی نہ یاد کرنے کی قسمیں کھائیں۔ کئی محفلوں میں انہیں برا بھلا کہا۔ ان کے اعزہ واقارب کے برے نام رکھے یہاں تک کہ انہیں کوسنے سے بھی باز نہ آئی۔ ہاں! یہ ضرور ہوا کہ جب میں انہیں کوسنے کے بعد چپ ہوئی تو دوسرے لمحہ میرے کان کھڑے ہو جاتے۔ دل لعنت ملامت کرنے لگتا اور اپنی تنہائیوں میں مجھے آنسوؤں کے سمندر سے گذرنا پڑتا۔ حالانکہ ہزار بار میں نے خود کو سمجھایا کہ ''اب کوئی بات نہیں۔''

فلم کی کہانی ذہن میں گشت کر رہی تھی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ میرا انجام بھی وہی ہوا جو انار کلی کا ہوا۔ لیکن میرے اس انجام کا ذمہ دار کون تھا۔ وہ۔ نہیں۔ میں۔ نہیں۔ پھر کون؟ کوئی نہیں۔ شام کا دھندلکا پھیلتا جارہا تھا سامنے سے کوئی آتا نظر آیا میری بہن نے مجھے ٹھوکا دیا۔ ''آپا جان.........'' وہ اس کے آگے کچھ نہ بول سکی۔ میں نے دیکھا مجھ سے صرف دو فٹ کی دوری سے میری مخالف سمت سے ''وہ'' سائیکل پر چلے آرہے ہیں مجھے لگا میں نقاب نوچ پھینکوں اور ان کی سائیکل پر کود جاؤں۔ اب بھی وہ مجھے اپنی پچھلی سیٹ پر جگہ دے دیں گے۔ میں ساری عمر ان کے پیچھے ان کا تعاقب کرکے

گذار لوں گی۔ کسی بھی فیصلہ تک پہونچنے سے قبل ہی ان کی سائیکل ایک لمحہ کے لئے میرے رکشہ کے برابر آئی اور گذر گئی۔ دونوں کی سمت مخالف تھی۔ یہی میرا نصیب تھا اور یہی وہ ایک لمحہ ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔

صرف دو برس پہلے مسلسل پانچ برسوں تک ہم دونوں نے ایک راہ پر ایک ہم سفر بن کر چلنے کی قسم کھائی تھی لیکن آج پورے دو برس بعد ایک لمحہ کے لئے بھی ہم دونوں کی سواری ایک دوسرے کے برابر کھڑی نہ ہو سکی۔ میرا جی چاہا میں رکشہ سے کود جاؤں اور چیخ چیخ کر انہیں پکاروں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ میں پکاروں گی تو وہ اپنی مسکراہٹ کا کنول لئے میرے قریب آئیں گے۔ مجھے "رانو" کہہ کر اپنے کلیجے سے چپکا لیں گے۔ پھر ہم دونوں شکایات کے دفتر کھولنے کے لئے لب کھولیں گے اور دونوں کے لب کچھ اس طرح بولنے لگیں گے کہ کانوں تک صدا نہ پہونچے گی۔ لب کی بات لب میں جذب ہو جائے گی۔ میں نے رکشہ سے کودنا چاہا لیکن میں نے مڑ کر دیکھا ان کی سائیکل دور نکل چکی تھی۔ شام کا دھندلکا تاریکی میں بدل گیا۔

وہی الجھے الجھے بال، رخساروں پر بکھری ہفتہ بھر کی داڑھی، چہرے پر وہی سنجیدگی۔ انہوں نے ایک نظر میری طرف اٹھائی لیکن مجھے یقین ہے وہ مجھے نہیں پہچان سکے ہوں گے جبکہ میں نے نقاب کی اوٹ سے انہیں جھانک لیا۔ اف! اور اگر انہوں نے مجھے پہچان لیا ہوگا تو ان پر کیا گذری ہوگی۔؟

مجھے یاد آ گیا جب میں انہیں کہتی آپ خوبصورت کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟ آپ کی داڑھی اکثر بے ترتیبی سے کیوں بڑھ جاتی ہیں؟؟ اور وہ مسکراتے ہوئے کہتے "رانو آرائش و زیبائش عورتوں کا حصہ ہے مرد تو سپاہی پیدا ہوتا ہے۔ سپاہی کا حسن اس کا جوش عمل ہے"۔ یہ سن کر میں مسرور اور مسحور ہو جاتی اور یہ سحر اس وقت ٹوٹتا جب وہ گفتگو کا رخ پھیر دیتے اور کہتے۔ "رانو! اگر میں خود کو نہ سنواروں تو کیا تم مجھے حقیر نظروں سے دیکھو گی۔"؟

ارے نہیں۔ اللہ توبہ۔ آپ تو میرے لئے ہر حال میں خوبصورت ہیں"۔

اس وقت مجھے وہ راتیں یاد آ رہی ہیں جب ان کی اور میری ملاقات میں نیا پن

تھا۔ معمولی پائجامہ پہنے ہوئے اوپر سے کھادی کی اونی چادر اوڑھے ہوئے جب وہ کرسی پر بیٹھتے تو یہی لگتا کہ کوئی دھوبی اپنا گٹھر بھول گیا ہے۔ سر جھکائے باتیں کیا کرتے۔ میں ان کے ذہن کی سمت موڑنا چاہتی اور وہ اس طرح اپنی ڈگر پر چلتے رہتے جیسے نپٹ بہرہ سڑک کے بیچوں بیچ سے گذر رہا ہو اور کاریں ہارن بجا بجا کر رک جایا کرتی ہوں۔ میں ہر روز منصوبے بناتی۔ آج ضرور ان سے کچھ گفتگو کروں گی۔ یہ کیا مشین کی طرح اپنے کام سے کام۔ ہمت سمیٹ کر پروگرام بنا کر میں بیٹھتی لیکن جیوں ہی ان کا بھاری قدم چوکھٹ کے اندر پڑتا میں سب کچھ بھول جاتی۔ وہ پوچھتے آج آپ نے کیا سب کیا۔؟ اور میں اپنی کاپیاں کھول کھول کر ان کی طرف بڑھاتی جاتی وہ اس کی تصحیح کرتے جاتے اور بس۔

میری بہن نے کہا۔ آپا جان اتریے نا۔ اپنا گھر آ گیا۔ خیالوں کا تسلسل ٹوٹا میں نے دیکھا قفس کا در ہمیشہ کی طرح آج بھی میرے لئے کھلا ہے۔ یہ وہ در ہے جس میں داخل تو ہو سکتی ہوں نکل نہیں سکتی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''امی میرے سر میں درد ہے میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔'' اور دوسرے ہی لمحہ لحاف میرے سر تک تن گیا۔ یہی وہ لحاف ہے جس میں اب بھی ان کے پیروں کی خوشبو بسی ہے جسے سونگھ کر آج بھی میرے نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں۔ جاڑے کی سرد رات میں جب وہ میرے یہاں آئے تھے تو میں نے انگیٹھی سلگا کر ان کے قریب رکھ دی تھی۔ انگیٹھی دیکھتے ہی انہوں نے حکم دیا تھا کہ اسے ہٹا لیا جائے۔ میں نے پوچھا تھا کیوں؟ کہنے لگے ''آگ مردوں کو کاہل بنا دیتی ہے''۔ میں نے انگیٹھی ہٹا لی تھی لیکن جب میں نے دیکھا تھا کہ ان کے پیر کھلے ہیں تو سردی سے میرا بدن کانپنے لگا تھا اور میں نے انتہائی انکساری سے کہا تھا۔ آپ کم از کم رضائی سے اپنے پیروں کو چھپا لیجئے اور وہ بادل نخواستہ اس کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ان کے پیروں کی یہی خوشبو میری حیات کا سرمایہ بن جائے گی۔ میرا گھر میرے لئے پہلے بھی قفس تھا لیکن اس قفس میں اچانک بہار آئی تھی۔ پورے پانچ برس اس بہار نے ڈیرہ جمایا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم کہ یہ پانچ برس کب اور کیسے گذر گیا میرے قفس کا دروازہ میرے لئے صرف اس لئے کھلا تھا کہ میں اندر آ سکوں۔ اس لئے نہیں کہ میں اس سے باہر بھی نکل سکوں۔

ان کے آنے کے بعد مجھے قفس سے رہائی کی امید بندھنے لگی تھی لیکن آج سے دو برس پہلے اس امید پر پانی پھر گیا۔

دو برس پہلے جب میرے قفس میں بھونچال آیا تھا۔ عزت و ناموس کی آندھی چلی تھی۔ جس کی زد پر میرا وجود جھولے کی طرح جھلایا گیا تھا۔ مجھے زبردست پینگ دی گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ان کی جانب لپکی تھی۔ قبل اس کے کہ ان سے جا ملوں جھولا لوٹ گیا تھا اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہا تھا۔ عزت کا شکوہ غالب آیا میں اپنا پر پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اس چڑیا کی طرح جسے قفس سے آزاد کر کے بند کمرے میں چھوڑ دیا گیا ہو اور پھر مجھے منظور کر لینا پڑا کہ یہ کمرہ ہی میری دنیا ہے۔ ان سے کبھی نہ ملنے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد ہی میں نے اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ میرا نیا جنم ہے اور آج میں یہ بھی یقین کر لینا چاہتی ہوں کہ میں جنم جنم کی اندھی ہوں۔ میں نے نہ کل کسی کو دیکھا تھا اور نہ آج دیکھا ہے۔ یہ ساری باتیں تو محض دیوانے کا خواب ہیں۔ آج پورے دو برس بعد.........

☆☆

وہ لکھتا رہے گا

یادیں انسانوں کو کتنی آزمائشات میں ڈالتی ہیں اس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جسے یادوں کو سمیٹ کر رکھنے کی عادت ہوتی ہے اور جو یادوں کو سرمایۂ حیات سمجھتا ہے۔ وہ شخص ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ جس کے لئے اس کی یادیں ہی سب کچھ ہیں۔ کسی شاعر کا یہ شعر ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اس کے حافظہ میں محفوظ ہے اور وہ اس کشمکش میں مبتلا ہے کہ اگر یادوں کا سرمایہ لٹ گیا ہوتا یا یہ دعا قبول ہوگئی ہوتی اور اس کا حافظہ اس سے چھن گیا ہوتا تو آج کیا ہوتا؟۔ یہ سوچ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یادیں بہر حال غنیمت ہیں۔ اس کے اثرات و نتائج جو بھی ہوں اور جیسے بھی ہوں۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد اس کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اس کی نظر میں اخبارات کی وہ سرخیاں گردش کرنے لگیں کہ آج ایک اور ملک ایٹمی توانائی والا ملک بن گیا۔ چاروں طرف سے صاحب اقتدار کو مبارکبادیاں اور بدھائیاں مل رہی تھیں۔ شہر شہر مٹھائیاں تقسیم کی جارہی تھیں۔ ریڈیو کے تمام نشریئے باری باری سے یہی مژدہ سنا رہے تھے۔ ٹی۔ وی پر دھماکوں کا مقام، سائنس دانوں کے چہرے، عیش و طرب کے مظاہرے اور سیاست دانوں کے پینترے دکھائے اور سنائے جارہے تھے لیکن وہ شخص ایک عجیب سی الجھن کا شکار تھا۔ عجیب سی کشمکش تھی جو اسے سخت کربنا کی میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ایک طرف ہنسنا اور مسکرانا چاہتا تھا کہ تمام ذرائع ابلاغ ہنس رہے تھے۔ کھلکھلا رہے تھے۔ اپنے اہل وطن کے ساتھ وہ بھی قہقہہ لگانا چاہتا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آواز حلق میں بند ہوگئی ہے اس کی زبان گنگ ہے اس کے ہونٹ سل گئے ہیں اور اس کی پیشانی عرق عرق ہے اسے لگتا تھا کہ وہ انگنت لوگوں کے ساتھ مقتل میں کھڑا ہے۔ جہاں ہر شخص کو یہ معلوم ہے کہ اس کا کیا

انجام ہونے والا ہے۔ لیکن بقیہ لوگ اپنی زندگی کی اس مہلت کو غنیمت جان کر زندگی کے آخری لمحوں تک ہنسنا چاہ رہے ہیں۔

اسے حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ آخر لوگ کیوں ہنسنا چاہتے ہیں؟ روتے کیوں نہیں ہیں؟ اب ان کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔ ان کی نسلیں تباہ ہونے والی ہیں۔ انسانی زندگی کرۂ ارض سے ختم ہونے والی ہے۔ بچے کھچے لوگ اپاہج، معذور اور ناکارہ ہو جانے والے ہیں۔ ان کی تباہی کے بعد جو لوگ بچ رہے ہوں گے وہ ان کی موت پر آنسو بہانے کے لئے آنسو تلاش کریں گے۔ اگر کچھ آنکھوں میں آنسو جمع ہو بھی جائے گا تو خود ان زندہ لوگوں کا کرب انہیں پی جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنا تعزیت نامہ لکھ کر اب ہر شخص کو رونا چاہئے۔ خوب خوب رونا چاہئے۔ وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی سوچ نے پلٹا کھایا اور وہ یادوں کی کھڑکی سے جھانکتا ہوا اس کانفرنس میں پہنچ گیا جس کا افتتاح صوبائی گورنر نے کیا تھا۔

شہر کے سب سے بڑے ہال میں جسے عرف عام میں ٹاؤن ہال کہا جاتا ہے وہ پہنچ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جس شہر کا باشی ہے گرچہ وہ ایک ضلعی شہر ہے لیکن اس صوبہ کے بہت سارے دوسرے اضلاع کے مقابلہ میں علمی، ادبی اور ثقافتی نقطۂ نظر سے زیادہ زندہ اور فعال شہر ہے۔ اس شہر کا یہ ٹاؤن ہال تقریباً سال بھر کسی نہ کسی تقریب کا مرکز بنا رہتا ہے اور اہلِ شہر کے لئے یہ ایک اچھی تفریح گاہ ہے لیکن وہ تقریب جس کی یاد اس کو ستا رہی تھی وہ قدرے مختلف تھی۔

انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کی صوبائی اکائی کے زیر اہتمام ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں ایک مجلس مذاکرہ کا بھی اہتمام تھا۔ اس مذاکرہ کا عنوان تھا۔ ''نیوکلیائی جنگ کے خطرات اور ڈاکٹروں کی ذمہ داریاں۔''

کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹروں کی یہ نفسیات ہے کہ وہ لوگوں کو بیمار دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ اسے فطرتاً اذیت پسند سمجھتے ہیں۔ جب کسی وبائی مرض کے پھیلنے کی خبر اخبار میں شائع ہوتی ہے تو ایسی خبر پڑھ کر ڈاکٹروں کے چہرے کھل جاتے ہیں اور۔ اس وقت اس کی مسرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب چارپائی پر لاد کر کوئی مریض اس کی کلنک تک پہنچ جاتا ہے۔

دیہاتوں میں یہ کہاوت مشہور ہے کہ گورکن اور ڈاکٹر میں اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تیمار دار مریضوں کی چارپائی ڈاکٹر کی کلنک میں رکھتے وقت ڈاکٹر کو مسکراتا ہوا

دیکھ کر بھی گورکن کے مقابلہ میں اس کی زیادہ قدر کرتا ہے اور اس کی مسکراہٹ کا برا نہیں مانتا ہے۔

ہال کی پیشانی پر ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ ''نیوکلیائی جنگ میں ڈاکٹروں کی حیثیت فضول ہو جائے گی۔'' یعنی ڈاکٹر جو دنیا بھر کی بیماریوں سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے جو کسی مریض کو بچا لینے میں اپنی کامیابی تصور کرتا ہے وہی ڈاکٹر اس خوف سے لرزاں ہے کہ اگر نیوکلیائی جنگ واقع ہوگئی تو ڈاکٹر بے دست و پا ہو جائیں گے۔ یہ خیال اس شہر کے چند ڈاکٹروں کا نہیں تھا بلکہ یہ رائے ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم کی تھی اور اس تنظیم نے اس اندیشہ کو سارے جہان میں پھیلانے کے لئے اس طرح کی کانفرنسیں کرانے کا اہتمام کیا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ ساری دنیا میں ڈاکٹروں کی تعداد معمولی ہے۔ ڈاکٹر خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ۔ ''دنیا میں ہر ایک لاکھ کی آبادی پر فوجیوں کی تعداد 556 ہے جبکہ ڈاکٹروں کی تعداد صرف 85 ہے۔'' اس معمولی سی تعداد کو کم عقل اور احمق بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ ایک جمہوری ملک میں۔ ع

بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

ان چند ڈاکٹروں کے بالمقابل کڑوروں کی آبادی کا یہ ملک ہے جس کی اچھی خاصی تعداد نیوکلیائی دھماکے پر جشن کا اہتمام کر رہی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا دماغ الجھن سی محسوس کرنے لگا اور وہ سوچنے لگا۔ ع

کسے وکیل کریں؟ کس سے منصفی چاہیں؟

اور تب اس کی نظر صوبائی گورنر کی باوقار شخصیت پر ٹک جاتی ہے جو شہ نشیں پر جلوہ افروز تھے۔ جو اس عظیم ملک کی عالمی شہرت یافتہ مرکزی یونیورسٹی میں علم کیمیا کے پروفیسر رہ چکے ہیں جنہوں نے مادوں کی ساخت اور جوہر کی طاقت کا تجربہ خود بھی کیا ہے اور دھماکوں کی شدت سے جو پوری طرح واقف ہیں۔ اعلان کے مطابق وہ مذاکرہ کا افتتاح کرنے والے ہیں۔ تمام سامعین شہ نشیں کی جانب متوجہ ہیں اور گوش بر آواز ہیں۔

''یہ ضروری نہیں کہ نیوکلیائی جنگ سوچ سمجھ کر ہی شروع کی جائے۔ یہ غلطی سے بھی شروع ہو سکتی ہے''۔ پلے کارڈ پر لکھے ہوئے اس اقتباس سے افتتاحی خطبہ شروع ہوتا

ہے پھر نیوکلیائی ہتھیاروں کے مضمرات اور اس کی تباہ کاریوں سے سامعین کو آشنا کرایا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ ''آج کی ایک نیوکلیائی جنگ کی تباہی پانچ ہزار دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے برابر ہے''۔ اس جملہ پر خطبہ ختم ہوتا ہے۔ سامعین کا سکوت ٹوٹتا ہے ہر شخص خوف اور اندیشوں میں مبتلا نظر آتا ہے اور موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہوتا ہے۔

وہ شخص جو خود بھی سامعین میں شامل ہے تخیل کی آنکھوں سے تباہ ہوتی ہوئی انسانیت کے اس بھیانک مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس مہیب انجام سے نسل انسانی کو بچانے کی تدبیر سوچنے لگتا ہے۔

افتتاحی کلمات کے بعد کلیدی خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ ''نیوکلیائی جنگ میں پچھتر کروڑ افراد کی فوری موت یقینی ہے''۔ جو لوگ زندہ بچیں گے وہ اس لائق بھی نہیں رہیں گے کہ مردوں سے اس زمین کو خالی کرا سکیں۔ فضا کی تابکاری سے نباتات جھلس جائیں گے۔ مکانات اور محلات کھڑے ہوں گے لیکن مُردوں سے بھرے ہوں گے۔ زمین پر رہنے بسنے والی سبھی ذی روح ناپید ہو چکی ہوگی۔................ اور اس طرح مذاکرہ میں شامل ہر مفکر نئے نئے انداز میں نئے نئے اعداد و شمار پیش کر رہے تھے۔ پورا ہال جو ڈاکٹروں سے اور ضلع بھر کے دانشوروں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ساکت تھا، متحیر تھا، خوف زدہ تھا اور متفکر تھا۔ یہاں تک کہ شرکائے مذاکرہ کو یہ ہدایت دی گئی کہ ''آج سے تمام ڈاکٹر اپنے اپنے رائٹنگ پیڈ پر سرنامہ کے بطور یہ جملہ لکھیں گے۔ ''نیوکلیائی جنگ روکو''۔ "Prenent Nuclear War"

دانشوروں سے یہ اپیل کی گئی کہ اپنی اپنی سطح پر نیوکلیائی جنگ کے بھیانک پن سے عوام الناس کو روشناس کرانے کے لئے تمام امکانی ذرائع استعمال کریں تاکہ عوامی بیداری کے ذریعہ نیوکلیائی جنگ کو روکا جا سکے۔ شاعروں، افسانہ نگاروں اور ادیبوں سے بھی استدعا کی گئی کہ اس مسئلہ کو اپنا موضوع سخن بنائیں۔

وہ شخص جو سینکڑوں سامعین کے درمیان اکیلا افسانہ نگار ہے اس عزم کے ساتھ باہر نکلتا ہے کہ وہ ضرور اپنے قلم کی جولانی دکھائے گا۔ اپنے قاری کو اس مسئلہ کی المناکی سے روشناس کرائے گا۔ لیکن پھر زندگی کے دوسرے مسائل نے اسے گھیر لیا۔

آج! برسوں کے بعد۔ جب اس کا اپنا ملک نیوکلیائی ہتھیار کی دوڑ میں شامل

ہوگیا تب اسے اپنی اس بے توجہی پر سخت غصہ آیا کہ اس اہم مسئلہ کو اس نے برسوں تک کیوں بھلائے رکھا۔؟

آج وہ دیکھ رہا ہے کہ اس براعظم کے دو روایتی حریفوں کے ہاتھوں میں نیوکلیائی دھماکوں کا پرچم ہے۔ دونوں طرف عوام کا جوش وخروش ہے۔ ان پر جوش لوگوں کے درمیان چند باہوش لوگ ہیں۔ وہ دم بخود ہیں۔ ایک طرف ان کے ہم وطن ہیں جوان کی نظر کے سامنے ''پچھتر کروڑ کی یقینی موت'' کے حصار میں داخل ہو چکے ہیں اور دوسری طرف سیاست دانوں کے ہاتھوں میں فریب کا ڈھول ہے جو زور زور سے پیٹا جارہا ہے۔

شہر کے چوراہے پر کھڑا افسانہ نگار سوچ رہا ہے۔ جہاں سیاست کا مداری ڈھول پیٹ پیٹ کر تماش بینوں سے تالیاں پٹوا رہا ہے اور تماشہ بیں نا عاقبت اندیشی کے شکار ہیں۔ اپنے انجام سے بے خبر صرف تماشہ دیکھنے میں مصروف ہیں اس ہنگامہ خیز ماحول میں وہ کہانی خاک لکھے گا۔

پھر وہ عزم کرتا ہے کہ وہ کہانی ضرور لکھے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کہانی سنے گا کون۔؟

کوئی نہیں۔! کوئی نہیں۔!!

کوئی نہیں سنے گا؟

ضرور سنے گا۔!

وہ کہانی لکھے گا۔ ضرور لکھے گا۔ اس وقت تک لکھتا رہے گا جب تک دنیا کے سارے نیوکلیائی ہتھیار تباہ نہ ہوجائیں۔ جب تک دنیا کو اس دردناک موت سے نجات نہ مل جائے۔ جب تک انسانی زندگی لائق قدر نہ ہو جائے۔ جب تک اللہ کی یہ زمین امن وامان کا گہوارہ نہ بن جائے۔

وہ لکھے گا۔!

وہ ضرور لکھے گا۔!!

آکاشوانی پٹنہ و دربھنگہ سے نشر شدہ

☆☆

رخ بدلتی ہوائیں

وہ شخص اپنی ابتدائے جوانی میں اس بڑے شہر میں رہا کرتا تھا جسے ریاستی راجدھانی کا درجہ حاصل تھا۔ ملک کی آزادی کے ابتدائی ماہ وسال تھے جب وہ اس شہر میں داخل ہوا تھا۔ ہر طرف انگریزی دور حکومت کے نشانات موجود تھے۔ سڑکوں پر شیروانی، چوڑی دار پائجامہ، دھوتی، کرتا، مرزئی، چوڑی، چوٹی اور ترکی ٹوپی پہننے والے چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ عورتوں کے جسم پر نقاب یا چہروں پر لمبے لمبے گھونگھٹ ہوا کرتے تھے۔ جا بجا انڈر شرٹنگ کے ساتھ فل پینٹ اور کبھی ہاف پینٹ والے لوگ جو عام طور پر گورے گورے ہوتے تھے اپنے اپنے سروں پر ہیٹ لگا کر نکلتے تھے۔ بعض کالوں کا جسم بھی اسی انداز میں سجا ہوا نظر آتا تھا لیکن ان کا نقال ہونا نمایاں تھا۔ ”یس مین، نو مین، گڈ مارننگ، حضور عالی، جناب والا، کورنش بجالاتا ہوں، آداب عرض کرتا ہوں، حضور بندگی قبول ہو، پرنام سر، مولانا صاحب، پنڈت جی، بابو صاحب“ کی صدائیں ہر طرف گونجتی رہتی تھیں۔ ایک ملی جلی تہذیب تھی، درمیان میں کوئی دیوار نہیں تھی۔ ملک کی زمین پر سرحدیں بن گئی تھیں۔ خاک وخون کی ہولی کھیلی گئی تھی لیکن تہذیب ورہائش میں کوئی دوری پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سب کا ایک موضوع تھا۔ ملک آزاد ہو گیا، ہم آزاد ہو گئے، ہمارا دشمن بھاگ گیا۔ اب ہم اپنا ملک اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے۔ ہمارا خواب پورا ہوگا۔ گاندھی جی قتل کر دیئے گئے ہم ان کے قاتل کو پہچان چکے ہیں۔ اب اس ٹولی کو کبھی سر اٹھانے نہیں دیں گے۔ نہرو جی، مولانا آزاد، سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا محمد علی جوہر، سبھاش چندر بوس، شہید اشفاق اللہ خاں، شری بابو اور مظہر الحق ہمارے درمیان اور ہمارے ذہنوں پر موجود ہیں۔ اب ہم اپنی کمزوریاں دور کریں گے۔ تعلیم عام کریں گے، غربت مٹائیں گے، اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں گے۔ ملک میں

صنعتی انقلاب لائیں گے ۔ ہرت کرانتی کو جنم دے کر خود کفیل بنیں گے۔ نئی زمین پر نئی تہذیب کی داغ بیل ڈالیں گے۔ ہر ایک جوان اور حوصلہ مند دل کی یہ آواز تھی جو اس کے اندرون میں بھی گونج رہی تھی۔

وہ شخص ریاستی راجدھانی میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور اپنی تعلیم کی تکمیل کی دھن میں لگا تھا کہ یکا یک اسے یہ خبر ملی کہ اس کے پتا جی اسے چھوڑ کر اچانک چلے گئے۔ یہ خبر سن کر وہ بھاگم بھاگ اپنے گھر آ گیا۔ اس کی تعلیم ابھی ادھوری تھی۔ اس کے پتا جی خوشحال اور بڑے کاشتکار تھے۔ گاؤں کے ہی نہیں علاقہ کے مشہور آدمی تھے۔ خیر پسند تھے، شریف النفس تھے، عوام و خواص میں ہر دلعزیز تھے۔ جب وہ شخص اپنے گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ پورا گاؤں مل کر اس کے پتا جی کا سوگ منا رہا ہے۔ علاقہ کے لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اس شخص نے دیکھا کہ چمڑو کاکا اور رمضو چاچا دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔

بابو صاحب آپ کے پتا جی ہمارے اپنے بھائی تھے۔ وہ اپنے مذہب کے پکے تھے لیکن نہ ان کی کوئی ذات تھی نہ ان کے یہاں مذہب کی تفریق تھی۔ بابو صاحب آپ ہمارے بچہ ہیں۔ ہمارے بیٹا ہیں، ہماری آنکھوں کا تارا ہیں۔ آپ مت گھبرائیں کہ ہم آپ کے ہر اچھے برے کے ساتھی اس طرح رہیں گے جس طرح آپ کے پتا جی کے ساتھ تھے۔ بہر حال پہلا مرحلہ جو پتا جی کے انتم سنسکار کا تھا وہ شخص اس سے فارغ ہوا پھر بقیہ کریا کرم کے مراحل سے گذرا۔ اس پوری مدت میں اس نے محسوس کیا کہ سچ مچ چمڑو کاکا اور رمضو چاچا اپنی زبان کے پکے ہیں اور قابلِ بھروسہ ہیں۔

وہ شخص جسے گاؤں کے لوگ پیار سے بابو صاحب کہا کرتے تھے۔ پتا جی کے انتقال کی خبر پا کر سخت دل برداشتہ ہوا تھا۔ یہ سوچ کر گھر آیا تھا کہ اب جب کہ پتا جی نہیں رہے تو وہ اس گاؤں میں رہ کر کیا کرے گا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی ساری جائیداد کو بٹائی پر لگا دے گا۔ تمام جانوروں کو فروخت کر دے گا۔ گھر نوکروں کے حوالہ کر دے گا اور ماں کو ساتھ لے کر شہر لوٹ آئے گا اور اپنی نامکمل تعلیم کو مکمل کرے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اعلیٰ تعلیم کے ادارے کم یاب تھے۔ بڑے بڑے شہروں

میں کچھ بڑے بڑے ادارے قائم کیے گئے تھے جہاں بڑے بڑوں کے بچے تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ لڑکے زیادہ پڑھتے تھے لڑکیاں اکا دکا نظر آتی تھیں۔ جو لڑکیاں پڑھتی تھیں ان کا گھرانہ عام طور پر ان زیر تعلیم لڑکوں کے گھرانوں سے بھی زیادہ اونچا ہوا کرتا تھا۔

اور یہاں اس کے گاؤں کا ماحول تھا جسے اس کے پتا جی نے سجا سنوار رکھا تھا یہاں غربت بھی تھی، جہالت بھی تھی لیکن محبت بھی تھی، اخوت اور بھائی چارہ بھی تھا۔ اس کے پتا نے ایک مضبوط زنجیر سے پورے گاؤں کو ہی نہیں پورے علاقہ کو باندھ رکھا تھا۔ چرّو کاکا اور رمضو چاچا اسی زنجیر میں بندھے تھے اور آج ان لوگوں نے وہ زنجیر بابو صاحب کے پاؤں میں لاکر ڈال دی تھی۔ بابو صاحب، کی فکر کی دنیا پلٹ گئی۔ بابو صاحب نے اس زنجیر کو ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا اور حوصلہ کی کمر کس کر اپنے گاؤں کو پکڑ لیا اور پھر ساری عمر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اپنے پتا جی کی بنائی ڈگر پر چلتے رہے۔ اسی زنجیر میں جسے ان کے پتا جی نے بنا رکھی تھی پورے گاؤں کو باندھے رکھا۔ ملک میں نہ جانے کیسے کیسے انقلابات آئے۔ نہ جانے کتنی بار انتخابات ہوئے۔ نہ جانے کتنے خانوں میں ہندوستانیوں کو بانٹا گیا ایک سماج کئی سماجی ٹکروں میں بنٹا۔ خون کی ندیاں جگہ بہ جگہ بہائی گئیں۔ آبادی کی آبادی نذر آتش کی گئی۔ گولیوں اور بندوقوں کی گھن گرج سے جنگل، کھیت، گاؤں اور شہر سب گونج اٹھا لیکن بابو صاحب کا گاؤں سب سے بے نیاز بابو صاحب کے پتا جی کی زنجیر میں بندھا رہا اور چین کی بنسی بجاتا رہا۔ اسی مدت میں بابو صاحب کی شادی بھی ہو گئی۔ ان کے گھر میں ایک چاند سا بیٹا بھی پیدا ہوا اور بابو صاحب نے اسے بھی پوری آرزوؤں کے ساتھ پڑھانا لکھانا شروع کر دیا۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ بیٹا پڑھتا پڑھتا بڑے شہر چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دن بھی آ گیا کہ جب بابو صاحب کا چھوٹا بابو پڑھ لکھ کر ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو گیا۔ پھر وہ مختلف شہروں سے ہوتا ہوا اس شہر پہنچ گیا جہاں سے اس کے پتا جی اپنی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر اپنے پتا جی کے رخصت ہونے کی خبر سن کر گاؤں واپس آ گئے تھے۔

چھوٹا صاحب جب گھر آتا تو بابو صاحب اس سے پوچھتے چھوٹے میاں۔ بابو صاحب اپنے بیٹا کو پیارے چھوٹے میاں ہی کہتے اس لئے کہ یہ لفظ ان کی نظر میں عزت و

وقار کا نام تھا۔ وہ میاں کو میاں مانتے تھے۔ میاں ٹیاں نہیں سمجھتے تھے۔

کیا حال ہے تمہارے شہر کا اور پھر شہر کی ان تمام سڑکوں، بازاروں اور گلیوں کے بارے میں پوچھتے۔ جنہیں چھوڑ کر وہ زمانۂ طالب علمی میں چلے آئے تھے۔

چھوٹا صاحب سب کا ایک ہی جواب دیتا۔

پتا جی سب کچھ بدل چکا ہے اب آپ کا شہر آپ کا نہیں رہا اب وہ ان لوگوں کا ہو گیا جواب وہاں رہ بس گئے ہیں۔

بابو صاحب کو چھوٹا صاحب کی بات پر یقین نہیں آتا وہ پوچھتے۔ چھوٹے میاں وہ بڑا سا میدان اب کیسا ہے۔؟

چھوٹے میاں کہتے۔ پتا جی اب وہ چھوٹا ہو گیا ہے اس میں کئی لکیریں کھینچ دی گئی ہیں۔ رات میں اس کے چاروں طرف طرح طرح کے دھندھے ہوا کرتے ہیں۔ گانجا، شراب، عصمت فروشی، قتل، لوٹ یہ سب کچھ ہوا کرتا ہے۔

بابو صاحب پوچھتے۔ اس بڑے گھر کا کیا حال ہے جس میں پورے صوبہ کی غذا محفوظ رکھی جاتی ہے۔

چھوٹے میاں کہتے۔ کہ اب اس کا دروازہ وقت بے وقت کھلتا ہے۔ اب اس میں سینکڑوں ہزاروں بورہ غلہ سڑ جاتا ہے۔ اس سڑے غلے کو چپکے چپکے بازار میں بیچ دیا جاتا ہے۔ وہی غلہ شکل بدل بدل کر ہماری غذا بنتا ہے اس بڑے گھر کے سایہ میں صرف گانجہ ہی نہیں اور کئی طرح کی اسمگلنگ کا کھلا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ جسم فروشی کے دھندے بھی اس کے سایہ میں ہوتے ہیں۔

بابو صاحب کو چھوٹے میاں کی ان باتوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور کھلے ہوئے منہ کے ساتھ چھوٹے صاحب کی بات سنا کرتے اور دل ہی دل میں چھوٹے صاحب کی بات کو جھٹلاتے بھی جاتے لیکن زبان سے ان کا اظہار نہیں کرتے۔ انہیں اندیشہ ہوتا کہ یا تو پیارے بیٹے کا دل ٹوٹ جائے گا یا پھر وہ اپنے پتا جی کو دقیانوسی سمجھ کر نظر سے گرا دے گا۔

چھوٹا صاحب جب گھر آتا تو پتا جی سے کہتا کہ اب چلئے ہمارے ساتھ ہماری کوٹھی پر رہیے۔ اب گاؤں کی زندگی میں مشکلات زیادہ ہیں۔ یہاں نہ سڑک ہے نہ بازار،

نہ اسکول ہے نہ ہسپتال۔ یہاں ڈاکٹروں کی جگہ پوری ڈسپنسری ایک جھولا میں بھری سائیکل پر گھومتی رہتی ہے۔ یہاں کے بچوں کو آج بھی وہی میاں جی اور پنڈت جی الف۔ ب۔ ت۔ ث، کا۔ کھا۔ گھا۔ نا۔ پڑھا رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو چکی ہے۔ میری بیوی اور بچے کسی بھی حال میں یہاں آنے کو تیار نہیں ہوتے اور میں بھی پتا جی صرف آپ سے ملاقات کے لئے یہاں آتا ہوں اس کے لئے مجھے بڑی تکلیفیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہاں جب میں آتا ہوں تو آپ کے چاروں طرف وہی بابا کے زمانہ کے جھری پڑے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔

بابو صاحب چھوٹے میاں کی یہ ساری باتیں سن کر بھی ان سنی کر دیتے تھے لیکن! اس بار انہیں صرف اس لئے مجبور ہو جانا پڑا کہ اب ان کی صحت کچھ زیادہ خراب ہو چکی تھی اور ایک بار وہ شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرا لینا چاہتے تھے۔ چھوٹے صاحب نے بھی بابو صاحب سے اس بار یہی کہا کہ پتا جی ایک بار چلئے میں آپ کا چک اب کرا دوں۔

بابو صاحب نے کہا۔ چلو چھوٹے میاں! اس بار تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ڈاکٹر کو دکھا لیتا ہوں لیکن میں زیادہ دن وہاں نہیں ٹھہروں گا۔

پتا جی! آپ پہلے سے یہ شرط لگا رہے ہیں۔ ٹھر جانے سے آپ کا کیا نقصان ہوگا۔؟ یہاں کا سارا کام تو اپنی جگہ چل رہا ہے۔ آپ تو اب یہاں بھی کہیں نہیں جاتے جس طرح آپ یہاں آرام سے بیٹھے رہتے ہیں اسی طرح وہاں بھی آپ آرام ہی سے رہیں گے۔ ہمارے پاس چپراسی، آرڈرلی، بڈی گارڈ سب کچھ ہے۔ سب آپ کی دیکھ ریکھ کریں گے۔

بابو صاحب بیٹے کی اس وسیع الظرف پیش کش کو سن کر مسکرا پڑے۔ زیر لب بڑبڑائے۔ چپراسی۔ آڈرلی۔ سیکورٹی۔ اور تب کہنے لگے۔

چھوٹے میاں! کیا بتاؤں تمہیں۔ میرے پتا جی، ماتا جی اور تمہاری ماں سب یہاں میرے ساتھ ہیں۔ میرے سینے میں ان کی یادوں سے اور محبتوں سے بھرے ہیں۔ میں ان کی وجہ سے بہت دھنوان ہوں۔ پھر جب سے میں نے تم سے وہاں کے حالات سنے ہیں میرا جی اس شہر میں جانے کو نہیں چاہتا۔ میں تو اپنے اسی شہر کو اپنی آنکھوں میں بسا کر

آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہوں جسے میں نے پچاس سال پہلے دیکھا تھا۔ جہاں شرافت تھی، محبت تھی، اعلیٰ تہذیب تھی، سکون واطمینان تھا، اپنا پن تھا

چھوٹے صاحب! مسکرائے۔آپ کے جیسے لوگ اس دنیا میں بہت کم ہیں۔ پتا جی! سچ یہ ہے کہ ہرنئی نسل پرانی نسل کو دقیانوسی اور بیک ورڈ سمجھتی ہے اور اپنے آپ کو فارورڈ اور اپ ٹوڈیٹ کہتی ہے۔ پتا جی میری بیٹی اب مجھ کو ماڈل بننے کے مشورے دیا کرتی ہے۔ اپنی ممی سے کہتی ہے۔ پاپا اتنے بڑے افسر ہیں لیکن مینٹالیٹی اب بھی وہی دقیانوسی ہے۔ پاپا ہم لوگوں کے ساتھ کیسے رہ سکیں گے؟ میری ماں سر پر آنچل ڈالے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ پورے گھر کے تمام لوگوں کو ساتھ لے کر جینے کی کوشش کرتی تھی۔ اسی ماں کی پوتی اب آدھے کپڑے اتار چکی ہے۔اوپر چھپاتی ہے تو نیچے کھول دیتی ہے اور نیچے چھپاتی ہے تو اوپر کا سب کچھ باہر اچھل پڑتا ہے۔ میری ماتا جی سب کو سنیہہ دیتی تھی سب کا دکھ بانٹتی تھی۔ چمڑو بابا رمضو بابا سب اس کے سگے سمبندھی تھے اور میری بیٹی ایک ہی چھت کے نیچے میرے ساتھ رہتی ہے لیکن ہماری ملاقات سنڈے کے سوا شاید ہی کسی دن ہوتی ہے اور اب تو اسے نینی تال بھیجنے والا ہوں۔

ارے میری اکلوتی پوتی کو تم اب نینی تال بھیج دو گے۔ وہاں کس کے ساتھ رہے گی؟ دیکھو چھوٹے میاں لڑکی کو ماں باپ کے سایہ میں اس کی نظروں کے سامنے رہنا چاہئے کہ وہ جب تک اپنے پتی کے پاس نہیں جاتی ہے اس وقت تک اس کے ماں باپ اس کے لئے قلعہ کا کام کرتے ہیں۔

پتا جی کی بات سن کر چھوٹے صاحب زور سے ہنس پڑے۔

پتا جی! اس کے سامنے تو صرف ایک بات ہے کہ وہ مجھ سے بھی بڑی افسری کرنا چاہتی ہے اور مجھ سے بھی آگے نکلنا چاہتی ہے۔ وہ بار بار کہتی ہے کہ اس دیش میں کیا رکھا ہے یہاں کے لوگ تو بیک ورڈ ہیں۔

چھوٹے میاں کبھی بیٹی کو سمجھایا کرو کہ جو اپنی جڑ پر اور اپنی زمین پر قائم رہتا ہے وہ سدا بہار ہوتا ہے۔ آب وہوا کی تبدیلی اچھے اچھے پھل دار پیڑوں کو بانجھ بنا دیتے ہیں۔

اپنے دیش سے بڑا کوئی دیش نہیں ہوسکتا۔ کیا وہ دنیا کے کمزوروں پر ظلم کے پہاڑ ڈھانے والوں کو فارورڈ مانتی ہے اور سارے انسانوں کو اپنا بھائی مان کر جینے والے کو بیک ورڈ۔؟ سمجھایا کرو بیٹا سمجھایا کرو!

پتا جی! آپ سچ مچ مہان ہیں۔ کاش آپ کے جیسے لوگ اس بھارت میں اور بھی پیدا ہو جائیں تو یہ بھارت مہان بھارت کا سمان برقرار رکھے۔ یہی نہیں ساری دنیا کے لئے ایک مثال بن جائے اور ساری دنیا سنور جائے۔ سنبھل جائے۔ سوَرگ بن جائے۔

پتا جی! آپ کتنے سادہ ہیں۔ کتنے شریف ہیں۔ کتنے عظیم ہیں۔ آپ برائیوں کو برا سمجھتے ہیں برائیوں کو آپ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھائیوں کو گلے لگا کر آپ اس دنیا سے چلا جانا پسند کرتے ہیں۔ پتا جی! آپ مہان ہیں۔ مہان!۔

پتا جی! آج کے بڑے بڑے لوگ۔ اچھے اچھے لوگ، پڑھے لکھے لوگ پروفیسر ہوں یا وکیل، ڈاکٹر ہوں یا انجنیئر، سیاست داں ہوں یا سماجی کارکن، تاجر ہوں یا کسان یہاں تک کہ دھرم کرم کرنے والے لوگ ہی کیوں نہ ہوں سب کے سب گلے گلے تک بدعنوانیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہر طرف ایک ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ آدمی آدمی سے پناہ مانگ رہا ہے لیکن ان تمام لوگوں کو یہ احساس بھی نہیں ہے کہ وہ برا کر رہے ہیں اور یہ دنیا ان کی وجہ سے جہنم کا نمونہ بنتی چلی جا رہی ہے۔ آپ کے جیسے لوگ ہی یگ پرش کہلائیں گے۔ آپ کی اچھائی کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے گناہوں کے سمندر میں آپ ایک ڈیلٹا ہیں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہیں لیکن آپ ہی تڑپتی انسانیت کا سہارا بھی ہیں۔ ایشور آپ کو لمبی زندگی عطا کرے۔

بابو صاحب! چھوٹے صاحب کی باتیں سن کر بہت گمبھیر ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے۔ کشمکش میں مبتلا رہے پھر بولے چھوٹے میاں! ایک لطیفہ سنو!

ایک راجا تھا بہت بڑا ظالم بدکار اور عیاش تھا۔ ساری رعایا اس سے تنگ تھی اور آٹھوں پہر ایشور سے یہ بنتی کرتی تھی کہ انہیں اس ظالم راجہ سے نجات عطا کرے۔ آخر ایک دن ایشور نے ان کی دعا سن لی۔ اس بادشاہ کا انت ہو گیا اور سزا کے طور پر اس کا دوسرا جنم سوَر کی جون میں کر دیا گیا۔ اب وہ بادشاہ سوَر بن کر ہر وقت غلاظتوں میں لت پت رہنے

لگا یہی اس کی زندگی بن گئی یہاں تک کہ ایشور کو اس سؤر نما بادشاہ کی حالت پر ترس آ گیا۔
ایشور نے ایک دن اپنا ایک دوت اس سؤر کے پاس بھیجا دوت نے آ کر اس سؤر سے کہا کہ ایشور کو اب تمہاری بدحالی دیکھی نہیں جاتی اب تم طئے کرو کہ دنیا میں اگر دوبارا بھیجے گئے تو کسی پر ظلم وزیادتی نہیں کروگے؟ ایشور چاہتا ہے کہ تمہیں اس بدحالی سے باہر نکال دے۔

چھوٹے میاں! تمہیں معلوم ہے کہ سؤر نے کیا جواب دیا۔ اس نے بڑی ہی بے نیازی سے کہا کہ جا کر ایشور سے کہہ دو کہ میں اس کا عادی ہو گیا ہوں مجھ کو تو یہ احساس بھی نہیں ہے کہ میں کہاں پڑا ہوں۔ ایشور کو خواہ مخواہ تکلیف اٹھانے سے منع کر دو۔ دیکھا تم نے انسان جب گرتا ہے تو وہ کہاں سے کہاں تک گرتا چلا جاتا ہے لیکن غلاظت تو غلاظت ہے اسے سؤر کے اچھا کہنے سے انسان اسے اچھا کیسے مان لے گا۔ جن باتوں کا ذکر تم نے کیا اور جن لوگوں کا نام تم نے لیا وہ سب اگر آج کی ان غلاظتوں کو غلاظت نہیں مانیں تو کیا ہوا؟ سچائی تھوڑے ہی بدل جائے گی۔ تمہاری ماں سر پر آنچل ڈال کر گھر سے نکلتی تھی تمہاری بیٹی بدن اچھال کر نکلتی ہے۔ تمہاری ماں کے زمانہ میں بلاتکار اکا دکا ہوا کرتا تھا آج ہر صبح وشام لٹتی ہوئی عصمتوں کی تصویر دکھائی جارہی ہے پیدا ہوتے ہی بچیاں ہوس کا شکار بن رہی ہیں۔ قتل و غارتگری کا گراف اوپر بھاگ رہا ہے وہ تہذیب جو چمکدار ملکوں کو غارت کر چکی اب تمہارے ملک کو روندنے چلی آئی ہے۔ چھوٹے میاں تم بھی سمجھو اور اپنے بچوں کو بھی سمجھاؤ!

چھوٹے میاں ہمارے ملک میں دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک وہ ہیں جنہیں آستھا ہے پنر جنم اور آواگون پر اگر وہ صرف اس حقیقت کو بھی مان لیں تو پاپ سے بھری اس دنیا میں بہت سارے گناہوں سے وہ بچ جائیں گے اور دنیا میں پاپ کی مقدار گھٹ جائے گی۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جس کا معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ جب وہ اس دنیا سے ایک بار چلے جائیں گے تو قیامت تک وہ لوٹ کر یہاں نہیں آسکیں گے۔ ان کے پیدا کرنے والے نے ان سے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم جو ذرہ برابر بھی نیکی کروگے تو میں اس کا بھی اچھا بدلہ دوں گا اور ذرہ برابر بھی برائی کروگے تو میں اس کی سزا ضرور دوں گا۔ یعنی جو برا کرے گا وہ جہنم دیکھ کر رہے گا دردناک عذاب کا مزہ اسے چکھنا ہی پڑے گا

اور یہ سب تھوڑی دیر کے لئے نہیں ہوگا اس کا کوئی انت نہیں ہوگا اور نہ اس میں کوئی کمی ہوگی۔

دوسرے دن بابو صاحب۔ چھوٹا صاحب کے ساتھ شہر چلے گئے۔ چھوٹا صاحب نے فوراً شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے اپنے پتاجی کی جانچ کرائی۔ ڈاکٹروں نے بہ اتفاق رائے یہ کہا کہ انہیں بڑھاپا کے سوا کوئی مرض نہیں اور بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں۔ یہ مشورہ بھی ساتھ ساتھ دیا کہ آپ سکون کے ساتھ زندگی گذارنے کی کوشش کریں۔ صبح وشام کچھ دور تک چہل قدمی کرلیا کریں۔

بابو صاحب نے دوسرے ہی دن چھوٹا صاحب سے کہا۔ بیٹا میں ذرا شہر کو ایک نظر گھوم پھر کر دیکھ لینا چاہتا ہوں۔

ضرور دیکھ لیجئے پتاجی۔ اس کے بعد آپ کو میری بات پر یقین بھی آجائے گا کہ اب یہ شہر آپ کا شہر نہیں رہا۔ ڈرائیور پتاجی کو شہر گھما کر لے آؤ۔

بابو صاحب نے کہا۔ نہیں بیٹا میں اپنی جوانی کے ان دنوں کو یاد کروں گا جب میں بھی تم جیسا تھا۔ میں سڑک پر چل پھر کر دیکھوں گا اپنی یاد تازہ کروں گا۔ تم اطمینان رکھو میں ناشتہ کرکے نکلتا ہوں شام تک اطمینان سے لوٹ آؤں گا اور کل گھر چلا جاؤں گا۔ بابو صاحب بیٹا کی سرکاری کوٹھی سے ناشتہ کرکے سیدھا پورب جانے والی سڑک پر ہوگئے۔ یہ سڑک، اس پر موجود ہسپتال، اس کے پاس کی وہ یونیورسٹی جہاں وہ تعلیم حاصل کرنے آئے تھے اور اسی طرح گنگا کا وہ گھاٹ جو وقتاً فوقتاً رنگینیوں سے بھر جایا کرتا تھا۔ وہ بغیر دم لئے دن بھر میں پچھم سے پورب اور پورب سے پچھم کی پوری آبادی کو دیکھ لینا چاہ رہے تھے۔ اسی دھن میں وہ اس علاقہ میں پہنچے جہاں سے کثیر مسلم آبادی شروع ہوتی ہے۔ اس آبادی کے شروع ہونے سے پہلے ہی ایک بوسیدہ مکان پر ایک لمبا سا سائین بورڈ لگا تھا جس پر شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بہت سارے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ وہ دراصل کسی سیاسی جماعت کا دفتر جس پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ۔ اس دیش میں رہنے کا ادھیکار صرف اسی کو ہے۔ جو ہماری آستھاؤں میں آستھا رکھتا ہے۔

بابو صاحب ٹھٹھک گئے۔ یہ کیا۔؟

یہ کیسا نعرہ ہے۔؟

اب دوسری آستھاؤں کا کیا ہوگا؟

یہاں سے جو ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب کے ماننے والوں کی لمبی چوڑی آبادی شروع ہوتی ہے اس کا کیا ہوگا؟

اس سے آگے جو شبد کیرتن کا جاپ کیا جاتا ہے اور جو گرو گرنتھ کا پاٹھ ہوا کرتا ہے اس کا کیا ہوگا۔؟

مہاتما بدھ کی اپاسنا کرنے والوں کا کیا ہوگا۔؟

کیا ہوگا۔؟

اب کیا ہوگا۔؟

بابا نظام الدین، بابا چشتی، بابا فرید الدین اور بابا شرف الدین کا کیا ہوگا؟

بابو صاحب یہ سب سوچ کر گھبرا گئے۔!

اف! میرے اس پیارے شہر میں ان لوگوں نے بھی ڈیرہ جمالیا۔ توبہ ہی بھلی۔

چھوٹے میاں ٹھیک کہتے تھے۔ اب یہ شہر وہ شہر نہیں رہا۔ مجھے اس شہر سے لوٹ جانا چاہئے۔ بابو صاحب وہیں پلٹ گئے سڑک کی دوسری جانب آکر انہوں نے اپنا رخ سیدھا پچھّم کی جانب کرلیا وہ جلد سے جلد بیٹا کی کوٹھی پر پہنچ کر یہ کہنا چاہتے تھے کہ انہیں آج ہی گاؤں واپس جانے دو۔ وہ ایسے شہر میں نہیں رہے گا۔ جہاں بھائی چارہ کی گردن ماری جا رہی ہو جہاں شدت پسندی کا رویہ اختیار کیا جا رہا ہو۔ پھر انہیں خیال آیا کہ وہ تو سڑک کے راستہ سے شہر آئے تھے اور اسی طرح اسی سڑک سے وہ اپنے گاؤں چلے جائیں گے۔ اس لئے ذرا اس اسٹیشن کو بھی ایک نظر دیکھ لیں کہ جس پر سے وہ ٹرین پکڑ کر گھر آیا جایا کرتے تھے۔

بابو صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے ان کے اندر اتنی تیزی آگئی۔ شاید یہ وہی طاقت تھی جو بیلوں کے اندر گھر لوٹنے کے وقت پیدا ہو جاتی ہے۔ نظر سے ادھر ادھر بھی دیکھتے جا رہے تھے کہ ایک اخبار فروش کی دکان پر نگاہ ٹک گئی۔ لٹکتے ہوئے تازہ اخبار کی شاہ سرخی تھی۔

''شہر میں امن مارچ کرنے آئی ہوئی مرکزی ٹیم پر سابرمتی آشرم میں شرپسندوں

کا حملہ‘‘۔

بابو صاحب بڑبڑائے۔ لیجئے آج مہاتما گاندھی دوبارا قتل کردئے گئے۔ آہ گاندھی جی۔ اب آزاد ہندوستان میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی۔

اسی سوچ میں گم بابو صاحب اسٹیشن کی جانب بڑھتے چلے جارہے تھے۔ انہیں اب یہ فکر بھی ستانے لگی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ گاندھی کے یہ قاتل۔ چلو گاؤں چلو کا نعرہ لگانے لگیں۔ بابو صاحب چاہ رہے تھے کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ کر گاؤں کی کمان سنبھال لیں۔ اپنے پتاجی کی بنائی ہوئی محبت کی وہ زنجیر جو چمڑو کاکا اور رمضو چاچا نے اس کے پاؤں میں ڈالی تھی اور جسے انہوں نے اٹھا کر اپنے گلے سے لگالیا تھا کہیں کمزور نہ پڑ جائے۔

بابو صاحب کی رفتار مزید تیز ہونے لگی۔ وہ لگ بھگ دوڑنے سے لگے۔ جیسے جیسے اسٹیشن قریب آرہا تھا گاڑیوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ منی بس، ٹمپو، ٹیکسی، رکشہ، سائیکل۔ اپنی اپنی رفتار میں اسٹیشن کی جانب ہر طرف سے بھاگ رہی تھی۔ ہارن کی بے ہنگم چیخ پکار پر بابو صاحب کبھی دائیں کبھی بائیں کتراتے چلے جارہے تھے کہ اسی دوران میں ایک ٹوو ھیلر پر جنس پینٹ شرٹ میں ملبوس ایک دوشیزہ اپنے پیچھے ایک نوجوان کو بٹھائے کچھ اس طرح سے گذری کہ بابو صاحب اس کی زد میں آگئے۔ دھکا زوردار لگا اور وہ گر پڑے۔ دوسری بھاگتی گاڑی بھی ہزار کوشش کے باوجود کئی سمتوں سے کئی دھکے مارتی چلی گئی۔ ٹوو ھیلر بھاگتی نکل گئی۔ ٹریفک پولس جو اسٹیشن گولمبر کے چاروں جانب کھڑی تھی کسی نے ٹوو ھیلر کو نہیں روکا۔ بقیہ ٹریفک رک گئی۔ چاروں جانب سے لوگ جمع ہونے لگے۔ بابو صاحب بیچ سڑک پر چاروں خانے چت پڑے تھے کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں چاروں جانب وہ دیکھ رہے تھے ہوش باقی تھا وہ صرف یہ جاننے کے آرزومند تھے کہ دھکا مارنے والے دونوں لڑکے کون تھے۔؟

آنکھوں کے اشارے سے انہوں نے ایک شخص کو بلا کر نحیف آواز میں پوچھا یہ دونوں لڑکے کون تھے۔؟

بابا! آگے جو ڈرائیور کررہی تھی وہ لڑکی تھی اسی نے آپ کو دھکا مار کر گرادیا۔ پیچھے

اس کا بوائے فرینڈ تھا۔

بابو صاحب نے حیرت سے پوچھا تھا۔ اچھا تو اب یہاں لڑکی ڈرائیو کرتی ہے اور لڑکا آرام سے بیٹھا رہتا ہے؟ ہاں بابا!

ایک دوسرے شخص نے بابو صاحب کو بڑھ کر یہ بھی بتایا کہ ''بابا وہ یہاں کے بڑے صاحب کی بیٹی تھی۔ اکلوتی بیٹی ہے شہر میں اسی طرح ڈرائیو کرتی ہے۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے''۔ یہ سن کر بابو صاحب کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ زیر لب بڑبڑائے اچھا تو وہ جولی تھی۔؟ اور تب ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ نئے زمانے کی نئی تہذیب کا نیا باب ان کی پلکوں کے باہر لٹک گیا۔

یکایک بھیڑ میں سے ایک اور شخص آگے بڑھا۔ بوڑھے کی صورت پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ پڑا۔ باپ رے باپ۔ ظلم ہو گیا۔ ظلم۔ ارے کیا ظلم ہوا۔؟

بھائی صاحب یہ تو ہمارے گاؤں کے بابو صاحب ہیں۔ دھرتی پر بھگوان کا دوسرا روپ۔ ظلم ہو گیا۔ ظلم ارے کیا بکتے ہو۔ مجمع سے کوئی بولا۔ ظلم ہوا تو اٹھا کر لے جاؤ لاش۔ سڑک کا جام چھڑاؤ۔

بھائی صاحب میں انہیں کیوں لے جاؤں۔ میں جا کر ان کے بیٹا کو خبر کر دیتا ہوں۔

کون ہے ان کا بیٹا۔ تم جانتے ہو۔؟

جی ہاں بھائی صاحب میں بھی پہچانتا ہوں۔ آپ بھی پہچانتے ہیں۔

ارے کون ہے وہ؟ جلدی بتاؤ۔؟

بھائی صاحب! وہی ہیں جو اس شہر کے سب سے بڑے افسر ہیں۔؟

اور تب کچھ ہی دیر میں لاش کے چاروں طرف لال رنگ کی بتیوں کی کئی گاڑیاں آکر کھڑی ہو گئیں۔ ڈھیر ساری پولس اور مختلف عملے چاروں طرف بکھر گئے۔ گاڑی سے اترنے والوں میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو باپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے نہ چہرے پر غم کے کوئی آثار۔ بس ایک بات تھی جو ہو گئی۔ ایک کہانی تھی جو ختم ہو گئی۔

☆☆

اور لکھنا ابھی باقی ہے

گذشتہ ہفتہ مجھ کو اس کا خط ملا۔ کتنی مدت کے بعد اس کی تحریر مجھ کو دیکھنے کو ملی تھی۔ یہ بات میں یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے پیارے دوست! ایک مدت کے بعد میں تم سے مخاطب ہوں۔ تم میری تحریر دیکھ کر حیران ہو گے۔ تم جاننا چاہو گے کہ میں تمہیں یہ خط کہاں سے لکھ رہا ہوں؟ کب لکھ رہا ہوں اور کیوں لکھ رہا ہوں؟ میں تم کو کب اور کہاں بتانا نہیں چاہوں گا البتہ یہ ضرور بتاؤں گا کہ کیوں لکھ رہا ہوں؟

اس نے سچ لکھا تھا۔ میں اس کی تحریر دیکھ کر ہی پہچان گیا تھا اور واقعی سخت حیرت میں مبتلا تھ کہ آخرش اس نے یہ خط کہاں سے لکھا ہے اور کب لکھا ہے۔؟ میں نے اس خط کو بار بار پلٹا تھا لیکن کہیں کوئی ایسا نشان نہیں تھا کہ جس سے کہاں اور کب کی گتھی سلجھے۔ میں پوسٹ آفس کی مہر تلاش کرنے میں بھی ناکام ہو گیا۔ تھک ہار کر میں نے خط پڑھنا شروع کیا تو حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ بات جو یہاں میرے چند قریب ترین لوگوں کو معلوم تھی اسے کیسے معلوم ہو گئی؟ اسے کسی نے بتایا کہ میں نے کہانی لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اس فیصلہ کو طشت از بام کروں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ دھیرے دھیرے جب میرے اس فیصلہ کا وقفہ طویل ہو گا لوگ بھول چکے ہوں گے کہ میں بھی کہانیاں لکھا کرتا تھا اور اس طرح دنیا کا یہ جھمیلا میں دنیا میں چھوڑ کر چلا جاتا۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ۔ ''تم نے یہ ارادہ کیوں کیا۔؟''

اس کا یہ سوال میرے سامنے تھا اور میں اسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کے اس خلوص نے باوجودیکہ مجھ کو حیرانی میں ڈال رکھا تھا مجھ کو مجبور کیا کہ میں اپنے اس ارادہ

کی وجوہات سے اسے روشناس کراؤں۔

اس ارادہ کے معاً بعد پھر یہ خیال آیا کہ یہ راز راز نہیں رہ سکے گا اور سوالوں کی بوچھار کو جنم دینے والا بن جائے گا اور میں الجھن سے نجات پانے کی بجائے مزید الجھنوں کو دعوت دینے والا بن جاؤں گا۔ پھر بھی اس کے خلوص کے آگے میرے قلم کا سر جھک گیا۔

میں یہ جانتا تھا کہ اسے کچھ بتانے سے پہلے مجھ کو اپنی مادری زبان کی حالت زار کا ذکر کرنا پڑے گا جسے میں نے اپنی ماں کے بعد سب سے زیادہ چاہا ہے۔ جسے عنفوان شعور سے تادم تحریر اپنے گلے کا ہار، اپنی نگاہوں کا مرکز، اپنی جدو جہد کا محور، اپنی جاگتی آنکھوں کا خواب، اپنی بے خواب راتوں کی مونس اور اپنی عزت و وقار کا مسئلہ بنائے رکھا۔ یہ میری پیاری زبان اب میری نگاہوں کے سامنے بستر علالت پر ایڑیاں رگڑ رہی ہے اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر پا رہا ہوں۔ حالانکہ عمر عزیز کے بہترین ماہ و سال میں نے اس کی خدمت میں لگائے۔ برسہا برس ایسے گذارے کہ اسے آنکھوں سے لگائے بغیر کبھی آرام کے بستر پر پاؤں نہیں پھیلایا۔ رات کے بارہ اور ایک ہی نہیں تین اور چار بجے تک اس سے شغل کرتا رہا۔ کبھی اسے آنکھوں سے لگایا کبھی ہونٹوں سے سٹایا، کبھی گنگنایا، کبھی مسکرایا، کبھی آنکھوں سے آنسو گرایا اور کبھی نوکِ قلم سے کاغذ کے سفید صفحات پر اسے منتقل کیا۔

میں نے سینکڑوں جوان دلوں میں اس کی محبت کی جوت جگانے کی کوشش کی۔ میں نے ہزاروں ہزار سنجیدہ و باشعور اذہان کے دروازوں پر دستک دی۔ میں نے اس کی سربلندی اور دل پسندی کے لئے ملامتیں سہیں، گالیاں سنیں لیکن نہ لکھنے سے باز آیا نہ پڑھنے سے، نہ بولنے سے، نہ سمجھنے سے، نہ سمجھانے سے۔ کہانیاں میں نے اس زبان میں اس لئے لکھیں کہ میں اسے ہر دلعزیز بنا کر زندہ رکھنا چاہتا تھا اور اس کی دلچسپیوں میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ شاعری کی تو اسی لئے اس کی عظمت کے گن گان کر سکوں اور سننے والوں کا دل اس کے عشق سے لہولہان کر سکوں۔

اے میرے دوست! میرے پیشِ نظر بابائے اردو مولوی عبدالحق کا یہ خیال ہمیشہ رہا کہ۔ ”زبان صرف اظہارِ خیال کا آلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی کا جزو ہے۔ ہر شخص جو اسے

بولتا یا کام میں لاتا ہے وہ اپنی بساط کے موافق اس پر اپنی زندگی کا کچھ نہ کچھ نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اس میں ہمارے تمدن و شائستگی، خیالات و جذبات، تجربات و مشاہدات کی تاریخ پنہاں ہے۔ ہر لفظ ایک زندہ شئے ہے جو اپنے منہ سے اپنی حکایت بیان کر رہا ہے۔ ہمارے اسلاف نے کیسی کیسی محنت و مشقت سے اسے پالا پوسا ہے اور اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ ایک مقدس میراث ہے جو نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہے۔ ہم ناخلف ہوں گے اگر ہم نے اسے قائم نہ رکھا اور اس کی ترقی و فروغ میں پوری کوشش نہ کی"۔

اب مجھے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہماری یہ کوشش رائیگاں ہوگئی۔ کل تک میں اس زبان میں کہانی لکھا کرتا تھا اب ہماری یہ زبان خود کہانی بنتی جا رہی ہے۔ میں اس کی یہ کہانی لکھنے کو مجبور ہو رہا ہوں۔ تمہیں بتاؤ کہ اب میں کہانی لکھنا بند نہ کروں تو کیا کروں۔؟

اے میرے دوست اس دکھ کے اور بھی کئی پہلو ہیں لیکن میں ....

قبل اس کے کہ میں مزید کچھ لکھتا میرا قلم رک گیا۔ میں اس الجھن میں دوبارا مبتلا ہوگیا کہ میرے اس دوست نے یہ خط کہاں سے بھیجا ہے اور کب لکھا ہے؟

میں جواب بھیجوں تو کہاں بھیجوں؟ اور کب بھیجوں۔؟

پھر ذہن میں بجلی کا ایک کوندا ہوا۔ میں نے قلم روک دیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ صبح ہوتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہی کیا کہ اس دوست کے دروازہ پر جا کر دستک لگائی جہاں اس کی جوان بیوی اس کے گھر میں پڑی اس کے خط کی راہ دیکھ رہی تھی اور جہاں اس کے بچے ہر رات یہ سوچ کر سو جایا کرتے ہیں کہ آج سے کل تک اس کے پاپا ضرور آئیں گے اور اس کے لئے ڈھیر سی مٹھائیاں لائیں گے۔

صبح کا وقت تھا بچے جاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے دوست کی بیوی نماز سے فارغ ہوکر اپنے لئے چائے تیار کر رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ بھاگ کر آئی اور دونوں کواڑ دو پٹ کھول کر سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یقیناً وہ صبح کی چائے پر انتظار کر رہی ہوگی اپنے بچوں کے پاپا کا۔ اور میں حیرت زدہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اضطراب محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا

کہوں۔؟ کیا پوچھوں۔؟

اس کیا۔کیا۔کی کشمکش میرے اندر جاری تھی جو داخلی تصادم کی شکل میں اختیار کر رہی تھی کہ اسی دوران میں اس خاتون نے سر جھکا کر مجھ سے کہا۔

''اندر آجایئے۔!''

ایک سجے سجائے کمرے میں اس نے مجھ کو بٹھایا اور بچوں کو آواز دی۔

''پپو۔!''

''پپی۔!''

''دیکھو کون آئے ہیں۔!''

بچوں نے چہکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔''ابھی آیا۔ابھی آیا''۔''کون ہیں۔؟ کون ہیں۔؟ پاپا آگئے۔؟''

میں نے دیکھا اس خاتون کا چہرہ جھک گیا۔معصوم سی ایک لہر اس کے چہرے پر آئی۔رکی اور چلی گئی۔

اب میرا خیال اندر اندر گم ہونے لگا۔میری آواز گھٹنے لگی۔میرے وجود پر ایک بیچارگی طاری ہونے لگی۔میری زبان گنگ ہونے لگی۔

بچوں کو ماں کا کوئی جواب نہیں ملا تو وہ سب بھاگتے بھاگتے آئے اور دروازہ پر آکر ٹھٹھک گئے۔''انکل! سلام علیکم۔انکل سلام علیکم''۔دونوں نے باری باری سے کہا جس سے میری خامشی کا تالا ٹوٹا۔میں نے سلام کا جواب دیا۔سبھوں کو پاس بلایا گلے سے لگایا۔پیشانیوں پر بوسے دیئے اور یہ بھول گیا کہ یہ سب تو اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والے ہیں اور میں انہیں ہمکتے بچوں کی طرح پیار کر رہا ہوں۔

''بیٹا۔انکل کے لئے چائے لے آؤ۔''

میرے دوست کی بیوی کی زبان دوسری بار کھلی۔بچے چلے گئے۔پھر ایک پر تکلف ٹرے کے ساتھ آئے اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے پھر حوصلہ جمع کیا۔دوست کی بیوی سے یہ کہے بغیر کہ میرے دوست نے

کل رات میرے نام ایک خط بھیجا ہے۔ سیدھا سا سوال کیا کہ "آپ کے پاس میرے دوست کا کوئی خط آیا ہے۔؟"

میں نے دیکھا کہ میرا یہ سوال پورا ہوتے ہی میرے دوست کی بیوی کی نگاہ میری جانب اٹھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس نے مجھ کو دیکھا۔ خاموش رہی۔ سر جھکا لیا اور اپنے پاؤں کی انگلیوں سے زمین کریدنے لگی۔ مجھ کو سخت دکھ ہوا کہ میں نے آج بلا وجہ اس کے سوئے ہوئے غم کے پہاڑ کو دوبارا اس کی آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ مجرم۔

میں نے اپنی حیرانی ختم کرنے کے لئے اس معصوم خاتون کو جو ہر صبح نماز پڑھ کر چائے پی لیا کرتی ہوگی اور اگلی صبح کے لئے دو پیالیاں دھو کر رکھ دیتی ہوگی آج دوبارا دکھ کے سمندر میں ڈھکیل دیا۔

بلا شبہ آج میں نے جرم کیا ہے۔

بچے پھر آ گئے۔ اس بار ان کے ٹرے میں چائے کی دو پیالیاں تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک میرے سامنے رکھ دیا اور دوسری اپنی ماں کی طرف بڑھا دیا۔

چائے پی کر میں اپنے گھر لوٹ آیا اور یہ سوچ کر سکون پا گیا کہ اب مجھ کو اپنے دوست کے خط کا جواب نہیں بھیجنا پڑے گا کہ کہاں اور کب کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا لیکن اندر کا ہیجان ابھی باقی تھا کہ اسی ہیجان خیز سمندر میں ایک اور پتھر آ گرا۔

یہ ٹیلی فون تھا میرے ایک قرابت دار کا۔

ہیلو۔!

جی! فرمایئے۔

میں .... صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔!

جی ہاں! فرمایئے! بول رہا ہوں۔!

اچھا اچھا! جناب! میں فلاں ....

جی جی پہچان رہا ہوں۔

اے جناب! آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کیوں لے لیا۔ہم لوگوں نے جب سے یہ خبر سنی ہے سخت فکر مند ہوں۔آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آپ کی کہانیاں جب ہم لوگ ریڈیو سے سنتے ہیں تو دل پر نہ جانے کیا گذرتی ہے۔ کس قدر حقیقت پسندانہ انداز میں آپ نہ جانے کون کون سی بات کہہ جاتے ہیں..........

میں پھر تفکر کے گہرے سمندر میں اتر گیا۔

لیجئے پھر وہی بات سامنے آگئی۔

اور وہ صاحب بھی نہ جانے کیا کیا بولتے چلے گئے۔

آپ نے تو کتنے سفید پوش چہروں کو حقیقت کا آئینہ دکھایا ہے۔

آپ نے مکار سیاست دانوں کی خوب خوب خبر لی ہے۔

آپ نے فسادات کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔

آپ نے تلک اور جہیز کی لعنت پر کھل کر بات کی ہے۔

سنتے سنتے میں نے ٹیلی فون رکھ دیا۔مجھ کو لگا کہ میں جس راہ کو چھوڑ کر آگے بہت آگے نکل جانا چاہتا ہوں اس دنیا کے لوگ مجھ کو دوبارا گھسیٹ کر اسی راہ پر پھر لگا دینا چاہتے ہیں۔

نہیں۔

ہرگز نہیں۔

اب میں کہانی نہیں لکھوں گا۔

کسے معلوم کہ جب میں کہانی لکھ رہا ہوتا ہوں تو میرے وجود میں کس قدر لرزش ہوتی ہے۔میرا دل کس قدر غمناک ہوتا ہے۔بے کسوں کی بے کسی اور کمزوروں و مجبوروں کی کسمپرسی میرے شعور کو کس طرح جھنجھنا دیتی ہے۔یہ خیالات ابھی ذہن سے زبان تک آئے بھی نہیں تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔

جناب! آپ نے ٹیلی فون پٹخ دیا۔!

ٹیلی فون کا کیا قصور ہے کہ جس پر آپ اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔جو کچھ آپ لکھ چکے ہیں وہ آپ کے قاری کا ہے اب اس پر آپ کا کوئی اختیار نہیں۔آئندہ بھی آپ کو لکھنا

ہی پڑے گا۔ اگر آپ اپنا فیصلہ نہیں بدلتے ہیں تو ہمیں اپنے فیصلہ کا سبب آپ کو بتانا ہی پڑے گا۔

لیجئے! پھر وہی الجھن۔؟

میں انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اب ایسے کام سے زیادہ دن لگا رہنا نہیں چاہتا ہوں جو کسی بھی نتیجہ پر مجھ کو پہنچا نہ سکے۔ میں نے کہانیاں لکھیں مگر مجھ کو نہ اس کی جزا ملی نہ سزا۔

میرے دو دو مجموعے شائع ہوئے لیکن لگا ہی نہیں کہ کوئی انقلاب آیا۔ میری درجنوں کہانیاں نشر ہوئیں اخبارات ورسائل نے انہیں چھاپا لیکن سب کی سب خلا میں گم ہوگئیں۔ ایسا گنبد بے صدا تعمیر کرنے کا کیا حاصل۔؟

لیکن میں نے پھر ٹیلی فون رکھ دیا اور اپنے کمرہ سے باہر نکل گیا یہاں تک کہ جب میں پر سکون شب میں اپنے بستر پر پر کیف نیند کی راہ دیکھ رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ ریسور اٹھایا تو وہی میرے قرابت دار۔

جناب میں جانتا ہوں کہ آپ مستحکم ارادہ کے آدمی ہیں آپ نے جب جو سوچا ہے وہی کیا ہے۔ کوئی پہاڑ بھی آپ کی راہ میں کھڑا ہوا ہے تو آپ نے اسے بھی عبور کر لیا ہے۔ کوئی مزاحم ومخالف قوت آپ کی راہ کبھی روک نہ سکی۔

لیکن آپ عجلت پسند بھی ہو سکتے ہیں یہ ہم لوگوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

آپ پر قرض ہے آپ کے قاری کا۔ آپ کے چاہنے والوں کا۔ آپ سے محبت کرنے والوں کا اور ان ان گنت بے زبانوں کا جنہیں آپ کی کہانیاں زبان عطا کرتی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔

میں اس دن سے اس فکر میں غرق ہو گیا کہ کیا واقعی میں عجلت پسند ہو گیا ہوں۔؟

میں جو کچھ آج کر رہا ہوں اس کا بدلہ آج ہی چاہنے لگا ہوں۔

بیشک قرآن نے انسان کو عجولہ کہا ہے۔ لیکن یہ تعلیم بھی ساتھ ہی ساتھ دی گئی ہے کہ یہ دنیا مزرع آخرت ہے۔ ہمیں آج سے زیادہ کل کی فکر کرنی چاہئے۔ سوچ کا یہ سلسلہ

جاری تھا کہ کئی لوگ یکا یک میرے گھر آدھمکے۔

میں نے ان سبھوں کا حسبِ معمول خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ چائے نوشی کے دوران میں آنے والے لوگ یوں گویا ہوئے۔

یہ بات عام طور پر موضوع بحث ہے کہ آپ نے کہانی نویسی بند کردی ہے۔

لیجئے پھر وہی سوال۔!

اب میں کیا کروں۔؟

کہاں بھاگوں۔؟

کس کس سے آنکھیں چراؤں۔؟

ہم لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جن موضوعات کو چھیڑا ہے وہ سبھی مسائل ابھی زندہ ہیں اور انہیں ریکارڈ کرنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

دیکھئے فسادات کا سلسلہ بند ہونے کے بجائے اور شدید ہوگیا ہے۔ اب ایک فساد نے پچھلے تمام فسادات کا ریکارڈ توڑ دیا۔ فرقہ پرستی کا خونیں پنجہ چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔

تلک اور جہیز کی چتا پر پہلے ماہ دو ماہ میں کوئی معصوم اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتی تھی اور اب کوئی دن ایسا نہیں گذرتا ہے کہ اخبار کی پیشانی پر معصوم چتاؤں کی راکھ کا قشقہ کھینچا نہ گیا ہو۔

رشوت اور گھوس خوری کا اکا دکا واقعہ اب معمول حیات اور کاروبار زندگی بن چکا ہے۔ اب لوگ رشوت لیتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر لیتے ہیں اور شان سے کہتے ہیں کہ کمیشن خور صرف میں ہی نہیں ہوں فلاں اور فلاں بھی تھے۔ فلاں اور فلاں بھی ہیں۔

سنو! میں ان تمام حقائق کو دیکھ رہا ہوں اور بے حد شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ادب تاریخ کا بنیادی، معتبر اور حقیقی مواد فراہم کرتا ہے۔ میں یہ سوچ کر دکھی ہوتا ہوں کہ کل کی نسل جب اس ریکارڈ کو دیکھے گی تو ہمارے عہد کے لوگوں پر کتنی لعنتیں بھیجے گی۔ وہ تو بس یہی سوچے گی کہ ہمارے اسلاف واجداد خود کو ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ سمجھتے تھے لیکن سارا گھنونا کام کرتے تھے۔

اور خدانخواستہ اگر آنے والی نسل نے ہمیں اپنا آئیڈیل مان لیا تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ موجودہ دنیا جہنم کا بدترین طبقہ بن کر رہ جائے گی۔ انسان ننگا پھرے گا۔ انسان انسان کی بوٹیاں نوچے گا۔ انسان انسان کے خوف سے بھاگتا اور پناہ ڈھونڈھتا پھرے گا۔ آج خیر اور بھلائی کی بات کرنے والے جو چند لوگ نظر آتے ہیں وہ بھی ناپید ہو جائیں گے۔

اور یہ جانتے ہو کہ اس دنیا پر آخری اختیار اور کلی اختیار صرف اور صرف اس خالق اصلی کا ہے۔ فیصلہ کن حکم صرف اور صرف اسی کا چلتا ہے اور اس خالق نے صاف الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ جب دنیا ظلم وعدوان سے بھر جاتی ہے تو میں سمندر میں ابال پیدا کر دیتا ہوں، آسماں سے آگ برسا دیتا ہوں، ہواؤں کو تیز چلنے کا حکم دے دیتا ہوں، بادل کو گرجنے کی قوت دے دیتا ہوں اور زمین کو ہلنے اور بار بار ہلنے کو کہہ دیتا ہوں یہاں تک کہ سارا کچھ تہہ وبالا ہو جاتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ دوستو کہ کہانیوں میں آج کے حالات رقم کرنا کتنا جوکھم کا کام ہے۔؟

اسی لئے کہانی قلم بند کرنے کا سلسلہ میں روک دینا چاہتا ہوں۔

صحیح فرمایا آپ نے۔ فکر کا یہ پہلو بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ آنے والی نسل پست ذوق اور کم معیار ہی ہو۔ اگر ہر آنے والی نسل بری ہوتی تو اس دنیا کی ترقی کب کی رک گئی ہوتی۔ کیا آپ نے یہ بات نہیں سنی ہے کہ دنیا میں آنے والی ہر روح اس کا پتہ دیتی ہے کہ رب العالمین ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ اس لئے آپ اس انداز میں سوچیں کہ اگر آپ جیسے لوگوں نے اس ذمہ داری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو خود آپ اہلِ قلم حضرات کے بارے میں آنے والی نسل کیا رائے قائم کرے گی۔؟ یہی نا کہ آپ کو رچشم تھے یا بزدل۔؟؟

تم نے صحیح کہا میرے بھائیو! میں قائل ہو گیا۔

تم لوگ صحیح کہہ رہے ہو۔ بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔!

۲۰۰۲/۱۲/۳۰ کو پٹنہ ریڈیو سے نشر

☆☆

BADALTE RUT KI KAHANIAN

(Fiction)

by : Prof. Zafar Habib

مصنف کی دیگر تصانیف

☆ آنگن آنگن ۱۹۸۰ء

☆ جنگل کا سفر ۱۹۸۵ء

☆ بدلتے رُت کی کہانیاں ۲۰۰۹ء

○ دو مجموعۂ مقالات

☆ تفہیمات و تنقیدات ۲۰۰۸ء

☆ فنکاران بہار (زیرِ طبع)

○ ایک شعری مجموعہ

☆ نور ُنکہت ُنوا (زیرِ طبع)

○ تبصرۂ کتب کے دو مجموعے

☆ المیزان حصہ اول (زیرِ طبع)

☆ المیزان حصہ دوم (زیرِ طبع)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-623-3